کلیات

حفیظ میرٹھی

ادارہ ادب اسلامی ہند

کلّیات
حفیظ میرٹھی

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان و گلستاں
آدمی ہوں، عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

حفیظ میرٹھی

حفیظ میرٹھی

ولادت ۱۰/جنوری ۱۹۲۲ء
متوفی ۷/جنوری ۲۰۰۰ء

کلّیات

حفیظ میرٹھی

-ناشر-
ادارۂ ادبِ اسلامی ہند
۲۷۰۳، بارہ دری، بلیماران، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

Kulliyat-e-Hafeez Meeruthi

Published by :

Idara-e-Adab-e-Islami Hind

2703, Baradari, Ballimaran, Delhi-110006

اشاعت : جولائی ۲۰۰۰ء

انتساب

حسین غزالہ فلاحی

شریکِ حیات جناب عتیق الرحمٰن

کے نام

تدوین

مسعود اختر

ترتیب

انتظار نعیم

قیمت : -/۱۴۰ روپئے

ملنے کے پتے :

ا۔ ادارۂ ادب اسلامی ہند

۲۷۰۳ بارہ دری بلیماران، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

۲۔ مرکزی مکتبہ اسلامی

ڈی۔ ۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

مطبوعہ : دعوت آفسٹ پرنٹرز، دہلی۔ ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

باسمہ سبحانہ

مقدمہ

حفیظ میرٹھی کی کلیات۔ اکیسویں صدی کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے' ایک لاثانی فکری و فنی میراث ہے جسے بیسویں صدی نے جاتے جاتے موجودہ صدی کو سونپ دیا ہے۔ غالب کے دیوان کو عبدالرحمٰن بجنوری نے انیسویں صدی کے ہندوستان میں وید مقدس کے بعد اس سرزمین کا سب سے اہم کارنامہ قرار دیا تھا' پھر بیسویں صدی کے نصف آخر میں --اقبال و ٹیگور کے بعد-- شاید جن چند اہل قلم کے ادبی کارناموں پر ہمارا ملک ناز کرے گا ان میں حفیظ میرٹھی کا یہ دیوان بھی ہے۔ یہ مجموعہ کلام ایک پوری صدی کی آواز ہے۔ اس کی تھرتھراہٹ' اسکی آرزو' اسکے خواب' اسکی اداسیاں' اسکے زخم اور اس کے ولولے سب حفیظ کے ساز غزل کے پردے پر نمایاں ہوئے ہیں۔ یہاں ایک ہمہ گیر زوال کا احساس بھی ہے اور ایک روشن مستقبل کی بشارت بھی۔ غالب اپنے عہد کے انحطاط پر فریاد کناں تھے ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

ان کے نزدیک کارخانہ ہستی کی ساری ہماہمی "چراغان سر رہگذر باد" سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ حفیظ اپنے خون جگر سے چراغاں کرنے اور زنداں و سلاسل اور دار و رسن کی منزلوں سے ہنستے کھیلتے گزر جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اتھاہ اندوہ' افسردگی' انتشار و اختلال کے درمیان یہ انوکھا انسان تھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ہمیشہ تازہ دم رہیں اور حالات سے شکست تسلیم کرنا جس کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آیا۔ مجروح' فیض اور جذبی جیسے حفیظ کے ہم عصروں کے یہاں یہ دلفریب رجائیت

جلوہ گر ہے ؎

دیکھ کلیوں کا چٹکنا سرِ گلشن صیاد
زمزمہ سنج مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں
(مجروح)

جذبِ مسافرانِ رہِ یار دیکھنا
سر دیکھنا نہ سنگ نہ دیوار دیکھنا
(فیض)

گلشن میں جوش گل تو بگولے ہیں دشت میں
اہلِ جنوں جہاں بھی رہے شان سے رہے
(جذبی)

اور حفیظؔ صاحب کا انداز ملاحظہ ہو ؎

ستم کی "تیغ یہ کہتی ہے سر نہ اونچا کر
پکارتی ہے بلندی کہ زندگی ہے ادھر

آباد رہیں گے ویرانے شاداب رہیں گی زنجیریں
جب تک دیوانے زندہ ہیں پھولیں گی پھلیں گی زنجیریں

حفیظؔ کو یہ احساس ہے کہ زندہ قومیں اپنے نصب العین پر نگاہ رکھتی ہیں اور اس کے حصول کا ان کو پختہ یقین ہوتا ہے مگر اس وقت شاعر افسردہ خاطر ہو جاتا ہے جب اپنے عہد کو بے یقینی کے دلدل میں پھنسا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے تیور ملاحظہ ہوں ؎

نہ دیکھیں گے چمن برباد ہوتے
کہ اس میں خون ہے شامل ہمارا

داد دیجے کہ ہم جی رہے ہیں وہاں
ہیں محافظ جہاں قاتلوں کی طرح

حفیظؔ میں غالبؔ کی طرح غم کو انگیز کرنے اور درد کو جزوِ حیات بنانے کا حوصلہ ہے۔ درماں طلبی کے ساتھ درد کو سہہ لینے کے وہ قائل ہیں۔ غالبؔ کہتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مگر حفیظ صاحب کہتے ہیں۔

گلوں سے داغ کانٹوں سے خلش لینے کو آئے ہیں
گلستاں میں ہم اپنے دل کو بہلانے نہیں آئے

حفیظ میرٹھی صاحب کی یہ کلیات یقیناً اہل نظر کے لئے معیار نظر کا کام کرے گی اور فکر و فن کے افق پر ان گنت چراغ روشن کرے گی۔ اس مجموعہ سے اس عہد کو ایک نئی روشنی ملے گی جس طرح گزشتہ صدی کے وسط میں پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے دور میں اقبال کے کلام سے ملی تھی۔ یہ عہد بھی غالب واقبال کے عہد کی طرح نئی ہلاکتوں، آزمائشوں اور دھماکہ خیز احوال سے دوچار ہے۔ نیو کلیائی جبر اور ثقافتی فاشزم کے شکنجے میں دنیا کی کمزور قومیں جکڑ اٹھی ہیں۔ نئے فتنے اور قیامت خیز ہنگامے اس کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ اس مرحلہ میں یقین ہے کہ امید و آرزو کے بے شمار چراغ اس کلیات سے روشن ہو سکیں گے۔

حفیظ میرٹھی صاحب کی پہلی کاوش کو "شعر و شعور" کے نام سے ۱۹۷۰ء میں ادارۂ ادب اسلامی ہند نے اس وقت کے اپنے مرکز ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) سے شائع کیا تھا۔ اس کی ترتیب ادارہ کے رفیق جناب عزیز بگھروی کی خصوصی جدو جہد کا نتیجہ تھی۔ حفیظ صاحب کی دوسری تخلیق "متاعِ آخر شب" بھی حفیظ صاحب کی نگرانی میں ادارہ ہی کے احباب کی محنت اور لگن کے نتیجے میں تیار ہوئی تھی اور ۱۹۸۶ء میں ہمارے دوست جناب حافظ رفیق احمد صاحب نے اپنے ادارہ الکتاب حیدر آباد سے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔

ادارۂ ادب اسلامی ہند کو فخر ہے کہ وہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اسلامی فکر و فن کی خشت اول رکھنے والے اپنے ایک راہنما، بے مثال دردمند و درد شناس انسان اور تخلیقی نادرہ کاری کی غیر معمولی صلاحیت کے حامل فنکار کی پوری زندگی کی فنی کاوشوں کو یکجا پیش کرنے کی بھی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ سرزمین میرٹھ کو اس پر بجا طور پر ناز ہے مگر وہ ایک آفاق گیر قلمکار تھا جس کے فنی کارنامے پورے عالم انسانیت کی مشترک میراث ہیں، جسے اس کو منتقل اور عام کرتے ہوئے ہمیں بے پناہ مسرت ہو رہی

ہے۔ کلیات حفیظ کی بہ عجلت اشاعت کے لئے عزیزہ حسین غزالہ فلاحی نے انتہائی ذوق شوق اور دلچسپی کا اظہار کیا اور حفیظ صاحب کا بکھرا ہوا غیر مطبوعہ کلام فراہم کر کے کلیات کی اشاعت کی راہ ہموار کی۔ تحریک ادب اسلامی کے قابل قدر افسانہ نگار برادر محترم جناب مسعود اختر نے بڑی دیدہ ریزی محنت اور لگن کے ساتھ حفیظ صاحب کے غیر مطبوعہ کلام کو جمع و مرتب کر کے حفیظ صاحب کی شعری وراثت کو محفوظ کرنے میں گراں قدر تعاون دیا جس سے کلیات کی صورت گری کرنے اور اس کو آخری شکل دینے میں غیر معمولی مدد ملی۔ ہم ان دونوں حضرات کے ممنون اور ان کے لئے دعا گو ہیں۔
ادارۂ ادب اسلامی ہند نے ۱۹۹۳ء میں حفیظ صاحب کی حیات و خدمات پر "حفیظ میرٹھی: فن اور شخصیت" کے عنوان سے ایک گراں قدر مجموعہ مقالات خوبصورت کتابی صورت میں شائع کیا تھا، جس میں اردو دنیا کے معروف ادباء و شعراو ناقدین کی وقیع تحریریں شامل ہیں۔ ان تمام تحریروں کے جستہ جستہ خوبصورت حصوں کو کلیات کی بھی زینت بنایا گیا ہے۔ ان شاہکار تحریروں کے خالق تمام قلمکاروں کا بھی ادارہ شکر گزار ہے۔

رفیق محترم اور معروف شاعر جناب عزیز بگھروی کی منظوم دل کش تخلیق بھی کلیات اور خالق کلیات کی عظمت کا اظہار کر رہی ہے۔ دہلی، میرٹھ اور بعض دیگر مقامات کے کئی احباب کا بھی بے حد شکریہ کہ انھوں نے کلیات کے کارِ اشاعت سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اور مختلف پہلوؤں سے تعاون دیا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ کلیاتِ حفیظ اُنھیں کے اِس شعر کے ساتھ دنیائے ادب کے حوالے ہے کہ ؂

میری باتوں پہ ہنستی ہے دنیا ابھی
میں سنا جاؤں گا فیصلوں کی طرح

دہلی — انتظار نعیم
۱۶ر جولائی ۲۰۰۰ء — جنرل سکریٹری، ادارۂ ادب اسلامی ہند

حرفِ چند

حفیظ میرٹھی کا کلام کلیات کی صورت میں قارئین ادب کے سامنے جلوہ گر ہے!

عصری سیاست نے آج دنیا کا جو نقشہ مرتب کیا ہے اس میں انتشار، کرب و بے چینی، دہشت اور آمرانہ رویوں کے رنگ بہت گہرے ہیں۔ اس نقشہ کی بنیاد مادہ پرستی پر رکھی گئی ہے۔ آج کا خوفزدہ انسان بے چہرگی اور بے سمتی کا شکار ہے۔ وہ خیر و شر کی پہچان سے تقریباً محروم ہے۔ اخلاقی قدریں اس کے لئے ایک نقطہ موہوم بن کر رہ گئی ہیں۔ وہ بے لگام خواہشات کے بحرِ بے کنار میں وقتی لذتیت کی خاطر غوطے لگا رہا ہے۔ دراصل نظریات کے انبار نے مثبت اور منفی اقدارِ حیات کو خلط ملط کر دیا ہے۔ انسانیت زر پرستوں کے تخلیق کردہ بتوں کے قدموں میں سرنگوں نظر آ رہی ہے۔

ان حالات میں دنیا کو ایک ایسے اعلیٰ و ارفع نظریہ کی ضرورت ہے جو اس کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو، جو اسے مثبت اقدار حیات اور راسخ العقیدگی کی جانب لے جائے اور اس کی فکر کو استقامت عطا کر سکے۔ کسی لاگ لپیٹ اور ہچکچاہٹ کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی ہی وہ بلند، مستحکم اور لازوال نظریہ ہے جو انسان کو فلاح و خیر سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

حفیظ میرٹھی کو یہ سعادت حاصل رہی کہ جن پاکیزہ عناصر کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے وہ سرتاسر اسلامی ہیں۔ جب کوئی انسان کسی پاکیزہ اور بلند نصب العین کے تحت زندگی گزارنا سیکھ لیتا ہے تو اس کی فکر و نظر بھی اسی نہج پر استوار ہو جاتی ہے۔ حفیظ میرٹھی اپنی فکر اور زاویہ نگاہ کے اعتبار سے بہت اونچے مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کا انقلابی لہجہ بہت سے شعراء کے مقابلے میں جداگانہ امتیاز کا حامل ہے کہ وہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

حفیظ کی شاعری کا بنیادی عنصر کردار سازی ہے۔ ان کے نزدیک کردار خودداری سے جِلا پاتا ہے۔ وہ صرف کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کر کے دکھانے میں یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جو کچھ بیان کیا ہے اسے اپنے کردار سے زندہ پیکر بھی عطا کئے ہیں۔

انسانی زندگی میں ادب بھی ایک محاذ ہے جہاں سے انسان کو شائستہ اور پُر امن معاشرے کی تعمیر کے لئے مہمیز کیا جانا چاہئے! اور جب کسی فنکار کو اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے تو وہ ایسی پر تاثیر زبان اور ایسا دل پذیر اسلوب اختیار کرتا ہے جو دل اور دماغ کو مسخر کر لے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے حوالہ جاتی شاعری کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ حفیظ کی شاعری اس کی بہترین مثال ہے۔ غالب و اقبال کے بعد حوالہ جاتی عنصر ان کے اشعار میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں بڑی تعداد میں ایسے اشعار موجود ہیں جنھیں آدمی بے اختیار اور خود کلامی کی کیفیت میں Quote کرتا ہے۔

حفیظ کے جذبۂ خلوص نے ان کی فکر کو فن کی بلندیوں پر پہنچادیا ہے۔ ان کی اسلامی فکر' ان کا انقلابی لہجہ اور منفرد رنگ و آہنگ ہی ان کی انفرادیت کی اساس ہے۔

عصری مسائل پر ان کی نظر گہری ہے۔ تعصب' فرقہ وارانہ فسادات' سماجی اونچ نیچ' عریانی' فحاشی' جنسی بے راہ روی' مہنگائی' مادہ پرستی' حرص و ہوس' بے ضمیری' منافقت' خدا فراموشی' بزدلی' ملت کا انتشار اور علماء سو کی اقتدار سے مرعوبیت' ان سب سے حفیظ حد درجہ بے زار ہیں۔

البتہ! کردار' خودداری' شجاعت' غیرت اور جابرانہ ماحول میں اعلان حق جیسی مثبت صفات انھیں زندگی سے بھی کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ ان صفات کی لفظی تراکیب کو انھوں نے کہیں بجنسہ استعمال کیا ہے اور کہیں ان کی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔

حفیظ کی شاعری نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ مطالعہ کے نقطۂ نظر سے ان کے کلام کو بقول اُن کے دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو تحریک اسلامی سے متاثر ہونے سے پہلے کی شاعری کا دور اور دوسرا تحریک اسلامی سے متاثر ہونے کے بعد کا دور (پہلے دور کی غیر مقصدی شاعری کا بڑا حصہ تو ضائع ہو گیا) تحریک اسلامی سے متاثر ہونے کے بعد والا کلام بھی موٹے طور پر دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو مقصدی کلام جس میں جذبات کا عنصر غالب ہے اور دوسرا دور اس مقصدی

کلام سے متعلق ہے جس میں جذبات کا عنصر کم اور فکر زیادہ ہے۔
حفیظ کی شاعری ان حضرات کے سامنے روشن دلیل کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے جو مقصد اور نظریہ کو ادب کے لئے زہر ہلاہل گردانتے ہیں' اور ان ادباء و شعرا کے لئے جو نظریہ کی سپر اور ہتھیاروں کے ساتھ ادب کے میدان کارزار میں اترنا چاہتے ہیں' یہ بہترین اور قابل تقلید مثال ہے۔ بقول حفیظ' یونہی چلتے چلاتے کچھ کہہ دینے سے شاہکار تخلیقات وجود میں نہیں آجاتیں۔ فن کے زور سے افکار و نظریات دلوں میں اترتے اور دماغوں میں جگہ پاتے ہیں۔
ان معروضات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلیاتِ حفیظ فکروفن کا ایسا لازوال مجموعہ شعری ہے جس سے قلب و نظر مسرت و انبساط کے ساتھ ساتھ بہترین رہنمائی بھی حاصل کرتے رہیں گے۔
کلیات کی ترتیب میں حفیظ میرٹھی کی ڈائریاں' کاپیاں' احباب کی بیاضیں' ویڈیو اور آڈیو کیسٹ پیش نظر رکھنے کے باجود ان کا خاصا کلام' خصوصی طور پر بہت سی نظمیں دسترس میں نہیں آسکیں۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام ''شعر و شعور'' اور ''متاع آخر شب'' کی غزلیں اور بعد کا سبھی کلام کلیات میں شامل کیا گیا ہے۔ ''متاع آخر شب'' کی ترتیب کے وقت صفحات کی تنگ دامانی کے سبب جو اشعار قلم زد کردئے گئے تھے ان میں سے بیشتر اب شامل کر لئے گئے ہیں۔ حفیظ کی نعتیں' منقبت اور حاصل شدہ چند نظمیں قارئین ادب کے لئے نادرو نایاب تحفہ ہیں۔
حفیظ نے متفرق اشعار مختلف موقعوں پر کہے ہیں اور ایسے اشعار بھی جو کسی وجہ سے مکمل غزل کا جامہ نہیں پہن سکے' ان کے منتخبات بھی کلیات میں شامل کر لئے گئے ہیں۔
کلیات کے مسودے کے جمع و ترتیب کے سلسلے میں عزیزہ حسین غزالہ فلاحی (دختر حفیظ میرٹھی) اور جناب رشید الدین احمد نے بے پناہ دلچسپی کا اظہار کیا اور بعض چیزوں کی نشان دہی کر کے آسانی بہم پہنچائی۔ جناب بھیا شیخ منظور محی الدین عیش میرٹھی' جناب نذیر میرٹھی' جناب عتیق الرحمٰن (داماد حفیظ میرٹھی)' جناب محمد زاہد علی اور جناب امیر الدین عاکف نے طرح طرح سے تعاون فرمایا۔
کلیات کی ترتیب کے لئے مسلسل مہمیز اور اس کی اشاعت ادارۂ ادب اسلامی ہند

کے جنرل سکریٹری جناب انتظار نعیم کی قوت ارادی اور عزم محکم کا شاندار نمونہ ہے۔ ان کی تیز گامی تساہل پسندوں کو نیند سے چونکا دیتی ہے۔ ہم ان سبھی حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کیونکہ ان کی پیش قدمی، تعاون اور مشوروں سے ہی یہ کام آسان ہو سکا۔

اللہ رب العزت حفیظ میرٹھی کی مغفرت فرمائے ان کو اجرِ عظیم عطا کرے اور ہم سب کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ (آمین)

--مسعود اختر

۶۶۸، آزاد کالونی، گلی نمبر۔ ۲
اسلام آباد، میرٹھ۔ ۲۵۰۰۰۲
۳۰ / مارچ ۲۰۰۰ء

کہکشاں دل میں بچھانے والا

غزل گو شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی بات اس طرح کہے کہ ماحول اس میں جھلکنے لگے اور ماحول کا قصہ اس انداز سے چھیڑے کہ اس کی شخصیت کی گہرائیاں سامنے آنے لگیں۔ یعنی -- فن کی درون نگری اور بیرون نگری یہ دونوں جمع ہو جائیں تو کمالِ غزل ہاتھ آتا ہے۔

حفیظ میرٹھی کی غزل نگاری کا یہ کمال ہے کہ بہت ہی سادہ زبان اور سادہ انداز میں شعر پڑھتے ہوئے وہ اپنے زخموں کو پھول بنا دیتا ہے۔ رنج و غم کی تپتی بھٹی کو وہ اپنے دل حساس میں روک لیتا ہے اور ہمارے سامنے گل و سمن بکھیرتا ہے جس سے آنکھیں شاداب اور مشام جاں معطر ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ شاعری دوسروں کو حوصلہ دلاتی ہے کہ وہ بھی آتش فشاں کے دہانے کے قریب ہونے کے باوجود مسکرا سکتے ہیں۔ بہر حال حفیظ نے زخم و گل کے درمیان ایک اور چیز بھی غیر محسوس سی رکھی ہے --- طنز! ایک ہوتی ہے گرم طنز، دوسری سرد طنز۔ حفیظ میرٹھی نے اسی سرد طنز کو اپنایا ہے جو بس خاص خاص اہل شعور و احساس کو محسوس ہوتی ہے، محسوس ہونے پر بھی نہ دل سے خون رستا ہے، نہ جگر پر آبلے پڑتے ہیں ؎

چاند کا کردار اپنایا ہے ہم نے دوستو
داغ اپنے پاس رکھے روشنی بانٹا کئے

حفیظ میرٹھی اتھاہ تاریکیوں میں گھر کر بھی یہ نہیں بھولے کہ وہ نور کے سفیر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے زخموں کو پہلے پھول بنایا، پھر پھولوں کے چراغ بنا لئے۔ وہ فن تھا، یہ فرض ہے۔ ہندی میں بھی دیپ اور کنول کے درمیان یگانگت رہی ہے۔ اردو میں بھی درد، لو، پھول سے اور پھول کو چراغ سے بڑا معنوی ربط ہے۔ سو حفیظ نے

"چراغ آخر شب" جلالیا ہے، اس کی کرنوں کی پریاں آگے اور چراغ جلاتی جائیں گی۔
"چراغ آخر شب"---جل رہا ہے اور ظلمت زدگان کو یقین دلا رہا ہے کہ میں نقیب
سحر کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ صبح کی سواری آرہی ہے۔

--نعیم صدیقی، لاہور

★

ترقی پسندی اور جدیدیت کے اس چالیس سالہ دور کی ہنگامہ آرائیوں میں چند
ادیب اور شاعر خاموشی سے ابھرے اور انہوں نے کچھ باذوق قارئین کو اپنی طرف
متوجہ کیا۔ ایسے ادبا و شعراء اور قارئین کا بھی ایک حلقہ بنا، جس نے ترقی پسندوں کے
دور عروج میں اپنے لئے "تعمیر پسند" کا نام پسند کیا اور جدیدیوں کے عروج سے کچھ
پہلے ہی اپنے "اسلام پسند" ہونے پر زور دینا شروع کیا۔ لیکن اس حلقے نے کسی ہنگامہ
آرائی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ لہذا اس کی کوئی انجمنِ تعریف و توصیفِ باہمی نہیں بننی۔
نتیجہ یہ ہوا کہ اس حلقے کا چرچا بہت کم ہوا۔ بہر حال گروہ بندی اور اشتہار بازی کی صفت
سے محروم ہونے کے باوجود یہ حلقہ اپنے طور پر ذوق و شعور کی پرورش اور ادب کی
تخلیق کرتا رہا۔

حفیظ میرٹھی اس حلقے سے ابھرنے والے ایک شاعر ہیں، جن کے فن کا مشک خود
مہکتا ہے، گرچہ اس کی تشہیر کرنے والا کوئی طبلۂ عطار تنقید کے بازار میں نمودار نہیں
ہوا ہے۔ حفیظ کی شاعری کی عمر وہی ہے جو آزاد ہندوستان کے مذکورہ بالا دونوں یا تینوں
ادبی رجحانات کی مجموعی عمر ہے، یعنی تشکیل و تکمیل فن میں حفیظ کا حصہ دو چار برس کی
بات نہیں، نصف صدی کا قصہ ہے۔ اتنی طویل مدت تک شاعری کا یہ پھول چمن اردو
کے گویا کسی دور افتادہ گوشے میں کھلا رہا، جس کی طرف نگاہ عام نہیں جا سکی، لیکن اس
صورتحال کی وجہ سے نہ تو پھول کی خوبصورتی میں کوئی فرق آیا ہے نہ اس کی خوشبو میں۔
کہا جا سکتا ہے کہ یہ کیفیت اقبال کے لالہ صحرا جیسی ہے ؎

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

حفیظ غزل کے شاعر ہیں اور وہ ہر قسم کے احساسات و خیالات کے اظہار کے
لئے غزل کے سانچے کو کافی سمجھتے ہیں۔ غم ذات اور غم یار ہو، یا غم حیات و کائنات اور غم

روزگار، حفیظ کے کہے اشعار میں ہر غم کا بیان ایک انداز تغزل سے ہوتا ہے۔ وہ ایک تحریک و تنظیم سے وابستہ ہیں، جس کے نشیب و فراز کے نقوش ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک پر شور دور میں زمانے کی نیرنگیاں دیکھی ہیں، ان کی زندگی میں حادثات بھی ہوئے ہیں اور ان کے قلب میں واردات بھی، انہوں نے اپنے اندر اور باہر کی دنیا کے واقعات کو شدت سے محسوس کیا ہے، ان کے مشاہدات و مطالعات و تجربات وسیع ہیں اور ہر مشاہدے، مطالعے اور تجربے کا اثر انہوں نے اپنے دل پر لیا ہے، یعنی وہ ان کی داخلی زندگی کا حصہ بن گیا ہے، لیکن شاعر کے تاثرات پر اس کے تفکرات کی گرفت ہے، اس کا احساس ادراک سے خالی نہیں ہے۔ شاعر کا اپنا سوچا سمجھا ہوا ایک محور فکر ہے، جو اس کے وسیع نصیب العین کا بخشا ہوا ہے۔ لہٰذا غزل کا یہ شاعر خام ذاتی جذبات کا اظہار نہیں کرتا، اپنے جذبات کو اپنے تصوارت کی روشنی میں پختہ کر کے پیش کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حفیظ کا تغزل بہت تربیت یافتہ، لطیف اور نفیس ہے۔ انسان کے موجودہ ماحول پر حفیظ کے یہ تیکھے تبصرے ان کے مخصوص انداز تغزل کی نشان دہی کرتے ہیں ؎

یہی بہت ہے کہ زندہ تو ہو میاں صاحب
زمانہ سن کے مرے غم کی داستاں بولا

حفیظ میرٹھی ہندوستان کے اسلام پسند شعرا کی صف میں ممتاز ترین مقام کے حامل ہیں۔ یہ مقام انہوں نے اپنے فنی ریاض اور شخصی خون جگر سے حاصل کیا ہے۔ بلا شبہ اس ریاض اور خون جگر پر انہیں ان کے نظریے اور فکر نے ابھارا ہوگا، مگر یہ شاعرانہ اوصاف انفرادی طور پر حفیظ کے اپنے حاصل کئے ہوئے ہیں۔ سواتی کی بوندیں سطح دریا پر بہ طور عام گرتی ہیں، لیکن موتی بننا اسی قطرے کو نصیب ہوتا ہے جس کی پرورش کوئی صدف اپنے آغوشِ خاص میں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ میں حفیظ کو ان شاعروں میں سمجھتا ہوں جن کی تربیت خواہ کسی مخصوص حلقے میں ہوئی ہو مگر اپنے حسن کلام کی بدولت وہ ادب کے دائرہ عام میں اپنے لئے ایک جگہ بنا لیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بات ایک شاعر کی ممکنہ عظمت کی دلیل ہے، اس لئے کہ جب تک فکر خاص عموم فن نہ حاصلِ کر لے فن کے دائرے میں اس کا اعتبار نہیں قائم ہوتا۔ چنانچہ یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ حفیظ کی اسلامی فکر فنِ شاعری کا رسوخ حاصل کر چکی ہے، اور اس طرح وہ

تحریک اسلامی سے وابستہ ان معدودے چند افراد میں ایک ہیں جو اردو کی مسلمہ ادبی روایت کے اب جزو بن سکتے ہیں اور تاریخ ادب میں اپنے آپ کو شخصاً درج کرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ شعرا کے ہجوم میں حفیظ کی اپنی آواز پہچانی جا سکتی ہے۔
--ڈاکٹر عبدالمغنی، پٹنہ

★

حفیظ کی زندگی کا خوردبینی مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ ان کا ہر قدم جاہلانہ نظام سے کشمکش اور دعوتِ مبارزت کی طرف اٹھا ہے اور ہر ہر موڑ پر انہوں نے حسن و خیر کو پامال کرنے والی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کی ہے۔ ان کے عہد اور ان کی نسل کے دیگر انقلاب پسندوں نے تو عشرت کدوں اور پر شکوہ و پُرسکون نشست گاہوں میں بیٹھ کر انقلاب کے نغمے لکھے ہیں مگر حفیظ نے زنجیر و سلاسل کے آہنگ پر انسانی ضمیر کی آزادی کے نغمے گائے اور طوق و آہن کے درمیان عظمت انسان کا اعلان نامہ تحریر کیا۔
حفیظ نے جب شاعری شروع کی تو ہندوستان میں شعر و ادب کی دنیا میں ترقی پسندوں کی جلالت و جبروت کا دور تھا۔ تقسیم ملک کے بعد فضا اس قدر مکدر تھی کہ اسلامی تہذیب و اقدار کا نام لینا بھی جرم تھا۔ پھر اسلام کو ایک انقلاب آفریں پیام اور ایک دعوت فکر و عمل کی حیثیت سے پیش کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس ماحول میں ایسے اشعار کہنا حریفوں کو دعوت جنگ دینے کے مترادف تھا۔ ملحدین وقت ہر طرف بغلیں بجا رہے تھے کہ اب خدا کا نام لینے والے سلامت نہیں رہ سکیں گے اور مشرقی تہذیب و اقدار کا ہمارے ترقی پسند دوست بڑے بھیانک قہقہوں کے ساتھ تمسخر اڑا رہے تھے۔ ایسے پر آشوب دور میں حفیظ کا ایسے اشعار کہنا اور اہل عشق کے قافلہ کو گرم سفر ہونے کے لئے آواز دینا کوئی معمولی دیوانگی نہیں تھی۔
حفیظ کی پوری شاعری کا موضوع عصر نو کا انسان ہے جسے وہ چھیڑتے، جگاتے، کچوکے لگاتے، نصیحت کرتے، طنز کا نشانہ بناتے، حوصلہ افزائی کرتے، زخموں پر مرہم رکھتے، دل جوئی و دل نوازی کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک باشعور اور بیدار مغز فن کار ہیں جو عصر رواں کے تقاضوں کا بھرپور احساس رکھتے ہیں اور اپنے دور کے انسان کو ان تقاضوں کی تکمیل اور اپنی عصری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا اہل بنانے کے آرزو مند ہیں۔ اس طرح ہم انہیں اس عہد کا ایک عظیم انسان دوست شاعر قرار

دے سکتے ہیں۔

--ڈاکٹر سید عبدالباری' ٹانڈہ' امبیڈکر نگر' (یوپی)

★

حفیظ' عصری غزل کے لئے ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے کلام میں ایک مخصوص انداز کا والہانہ پن پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے شعر خود بے اختیار ہو کر غزل کا قالب اختیار کر کے گنگناتا اٹھتا ہے اور قلب و نظر کی بسیط گہرائیوں میں فکر و تاثر کی بازگشت پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے عالم میں ہم حفیظ کے کلام سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور گہری سوچ میں گم بھی ہو جاتے ہیں۔

--ڈاکٹر ابن فرید' رامپور (یوپی)

★

حفیظ صاحب کا رویہ ایک تخلیقی اور متحرک رویہ ہے۔ وہ نہ تو پرانے رسم پرست شاعروں کی آواز میں آواز ملا کر ممیونانہ نقالی کے مرتکب ہوتے ہیں' اور نہ دوسری انتہا پر پہنچ کر صنف غزل کو اسکی صنفی آرائش و زیبائش سے عاری کر کے ایک بے جان و بے آب و رنگ ڈھانچہ ہی بنا ڈالنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں غزل کی روایت کی پاسداری بھی ہے اور غزل کے فنی لوازم کا احترام بھی۔ غزل کے رموز و علائم کو انھوں نے سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔ بہت سی علامتوں کو ان کے فرسودہ بے جان متعلقات کے ساتھ ترک کر دیا ہے' مفید و کارآمد علامتوں کے امکانات سے فائدہ اٹھایا ہے' اور تقریباً ہر جگہ تخیل اور جذبے کی خلاقانہ قوت سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ خارجی حقائق اور مادی مسائل حیات کی طرف سے بھی وہ اپنی آنکھیں بند نہیں کرتے' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں زندگی کے ٹھوس کوائف سے نبرد آزما ہونے کی ایک شدید کوشش نظر آتی ہے۔ اور زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس جدوجہد میں جو نازک ترین مقام آتا ہے اور جس سے صحیح سلامت گزرنا کسی ہمالیائی مہم کو سر کرنے سے ہرگز کم نہیں یعنی فنیت اور مقصدیت کا کامیاب امتزاج' تو اس سلسلے میں حفیظ صاحب ہر جگہ نہیں تو اکثر مقامات پر قابل تعریف کارکردگی کا ثبوت دیتے ہیں۔

--اختر انصاری دہلوی

★
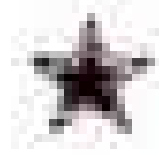
خدا بھلا کرے مولانا عبد الشکور کا جنہوں نے حفیظ کو مولانا مودودی کے افکار و نظریات سے روشناس کرا کے انہیں مقصدی اور تعمیری شاعری کا سنگِ بنیاد بنا دیا۔ پھر حفیظ کی شاعری کے موضوعات ہی نہیں بدلے معروضی خصوصیات بھی تبدیل ہو گئیں۔

حفیظ سر تاپا مقصدیت کے سانچے میں ڈھلنے کی باوجود غنائیت آہنگ اور لب و لہجہ کی انفرادیت کے علمبردار رہے ہیں۔ اگر چہ اس مقصدیت کی بدولت انہیں اپنے زمانے کے ادب' تہذیب و تمدن اور سیاسی و سماجی اقدار سے بھی متصادم ہونا پڑا' لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے خون جگر سے معجزۂ فن کی نمود کے لئے اپنے شاعرانہ فرائض سے روگردانی نہیں کی۔

--ڈاکٹر انجم جمالی (مرحوم) میرٹھ

★
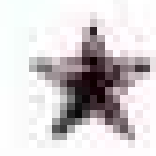
حفیظ کی شاعری پر نظر ڈالئے تو باوجود یکہ انہوں نے غزل کے کوچے سے باہر قدم نہیں رکھا' ان کی غزل ان بہت سے اعتراضات کا مصداق نہیں بنتی جو ہمارے بزرگوں نے عام غزل پر صادر کیے۔ یہ درست ہے کہ اس میں خیال بندی مسلسل نہیں ہے' لیکن یہاں محض خیالات کی ''جگالی'' نظر نہیں آتی' یہاں عشق و عاشقی کا فرسودہ تصور نظر نہیں آتا' یہاں عشق کی معاملہ بندی بھی نہیں ہے' یہاں بندھے ٹکے روایتی مضامین بھی نہیں ہیں' یہاں تخیل کی وہ فضا بھی نہیں ہے جس کا زندگی سے کوئی ربط ہی باقی نہ رہے' یہاں بے بنیاد خیالی مضامین بھی نہیں ہیں' یہاں درد و غم کی وہ سوزش بھی نہیں ہے کہ ہر شعر سے دھواں نکلتا معلوم ہو۔ ان سب کے بجائے یہاں زندگی کے مسائل ہیں جن کے تجربے سے شاعر گزرا ہے' ان میں ارضیت ہے' زندگی کی بو باس ہے' چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دکھوں کے انعکاسات ہیں' یہاں اجتماعی تصورات کا عکس نظر آتا ہے' یہاں اخلاق نکتے ہیں' خیر پر پختہ عقیدہ سے پیدا ہونے والی روشنی ہے' انسانیت کی فلاح کا تصور ہے' آرزوئیں ہیں اور مایوس ہوئے بغیر شکست آرزو کی تصویریں بھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ غزل زندگی کے متنوع پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے لہجہ میں اجنبیت نہ ہوتے ہوئے بھی تازگی و توانائی کا احساس ہوتا ہے۔

--پروفیسر عتیق احمد صدیقی' علی گڈھ

★
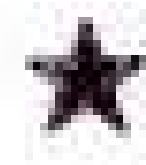
ان کی شاعری کا پہلا وصف یہ ہے کہ بیان بہت واضح اور راسخ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی فکر میں بھی رسوخ اور استقامت ہے۔ یہ کیفیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان کسی مقصد کے ساتھ جینا سیکھ لیتا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے کھانا پانی جتنا ضروری ہے اعلیٰ تصور حیات اس سے بھی زیادہ بڑی اور بنیادی ضرورت ہے' ورنہ انسان اور حیوان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ فکر کی استقامت نے ان میں ایسی بصیرت پیدا کر دی ہے جو فرد کو اور اس کے کردار کو گہرائی میں اتر کر دیکھتی ہے اور اپنے ماحول پر بھی حکیمانہ نظر ڈال سکتی ہے' وہ جھوٹے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوتی۔

ان کا اسلوب تازہ کار اور براہ راست ترسیل کرنے والا ہے اس لئے اس میں بانکپن بھی ہے' تیور بھی اور وہ بھی جسے اساتذہ سخن "مزہ" کہتے تھے۔

حفیظ کا شعری رویہ اتنا واضح ہے کہ کہیں کسی تاویل کی ضرورت نہیں' نہ ان کے اشعار کو تشریح درکار ہے۔

حفیظ کی شاعری میں ندرت اس اعتبار سے بھی ہے کہ انہوں نے فرسودہ و پامال مضامین سے اپنی شاعری کو بوجھل نہیں بنایا' نہ صدیوں کی گھسی ہوئی علامتوں کا استعمال کیا ہے۔

حفیظ کی شاعری ان کی اپنی ہے۔ انہوں نے نہ اساتذہ کے مضامین پر ہاتھ صاف کیا ہے نہ دوسروں کے اشعار کا ترجمہ کیا' نہ کسی کا چربہ اتارا ہے' اس لئے ان کی غزلوں کی زمینیں بھی ایسی ہیں جن پر ہم عمروں نے کم طبع آزمائی کی ہو گی۔ مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ شاعری میں حفیظ کا اپنا اسلوب ہے' اپنا رنگ ہے۔ یہ شاعری مقصدیت سے خالی نہیں اور یہ فن کی وہ منزل ہے جس کی افادیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس شاعری کے آئینے میں ہمارا عہد ہی نظر نہیں آئے گا آنے والی نسلیں اپنے عہد کو بھی انہیں الفاظ کے پردوں میں تلاش کر سکیں گی۔

--پروفیسر نثار احمد فاروقی' دہلی

★
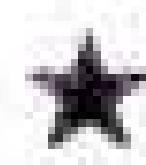
حفیظ میرٹھی ہر اعتبار سے ایک تعمیری ذہن اور ارتقا کی فکر کے شاعر ہیں۔ ان کی

فکری سطح کافی اونچی ہے' فنی قدروں کا بھی انہیں بھرپور ادراک ہے۔ ان کے مشاہدات اور تجربات کا منظر نامہ بھی وسیع اور کشادہ ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی بصیرت کو اس طرح اپنی بصیرت بھی بنایا ہے جس طرح کوئی درد منداور حساس فنکار اپنے عہد کے درد کو اپنا درد بنا لیتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی غزل گوئی میں بھی فنی لوازم کے احترام کے ساتھ 'متحرک و مجسّس روایت پسندی اور مقصدیت کی آنچ کا رقص بھی ملتا ہے جس میں محض رمزیت اور ایمائیت ہی نہیں بلکہ تخیل اور جذبے کی خلاقانہ قوت بھی ہے۔ اس لئے ان کی تمام تر شاعری بہ حیثیت مجموعی ملی احساسات اور جذبات سے بھی مملو ہے۔
---ابوالفیض سحر' دہلی

★

میں نے ہمیشہ خود کو ان کا عقیدت مند پایا۔ وہ ان گنے چنے شعراء میں سے ہیں جنھوں نے قلم کی آبرو اور عصمت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی' خود مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ ان کے قلم میں قادرالکلامی کے علاوہ راست روی کی طاقت بھی ہے۔ ان کے کلام کی پختگی اور اسلوب کے استحکام کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔
حفیظ صاحب کے اشعار کے دروبست کو خراج نہ دینا ناانصافی ہوگا---لیکن ؎

بہ خوں آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسیں
تو اول زیب اسپ و زینت بر گیشواں بینی

(تم تو گھوڑے اور اس کے سازوسامان کی زیب و زینت دیکھنے میں لگے ہوئے ہو' غازی کے خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھ اور خون آلودہ تلوار ستائش سے محروم رہ گئی)

غازی کا ذکر آ گیا تو یاد رکھئے کہ حفیظ میرٹھی گفتار کے ہی نہیں کردار کے بھی غازی ہیں۔ انھوں نے جرأت حق گوئی کی قیمت بھی ادا کی ہے۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائی ہیں۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ دار و رسن نے ان کی پذیرائی نہیں کی اسے جمہوریت کا فیض سمجھئے' ورنہ یہاں بھی وہ پیچھے نہ ہٹتے۔

حفیظ صاحب ترنم سے شعر پڑھتے ہیں' مشاعرہ کے کلاسیکی ترنم سے جواب شاذ ہی سننے میں آتا ہے۔ حفیظ میرٹھی کی شان امتیاز ان کی صداقت 'اخلاص' دل سوزی اور جوش میں ڈھونڈئے۔ وہ زمانہ کی روش اور ترغیبات سے بالکل الگ رہ کر فکر اور ضمیر کی آزادی کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری' وضع قطع' رفتار و گفتار' سب

عزتِ نفس کا اعلان کرتے ہیں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

سید حامد (آئی۔اے۔ایس' ریٹائرڈ) دہلی

★

حفیظ صاحب کے سینہ میں شاید کوئی بھٹی رکھ دی ہے جو سلگتی رہتی ہے' زبان پر اشعار کی شکل میں اور آنکھوں سے قطروں کی شکل میں نکل کر انسانی دنیا پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اسی لئے حفیظ صاحب نے غزل کو رخِ یار موجِ خمد اور رنگ بہار میں محصور رہنے نہیں دیا۔ وہ جذبوں کے شاعر ہیں۔ اپنی غزل میں معاشرتی جذبات کی نمائندگی بھی کرتے ہیں' ان کا ایقان ہے کہ۔

شاعری اک درد بھی ہے درد کا اظہار بھی
یہ تڑپنے اور تڑپانے کا فن اچھا لگا

یہی بنیادی عنصر ان کی شاعری میں روح کی طرح ساری و جاری ہے۔

حفیظ میرٹھی انسان دوست ہیں' انسانیت کی تلاش میں رہتے ہیں' اس کی قدر کرتے ہیں' انسانوں کو انسان کی غلامی سے آزادی دلانا چاہتے ہیں اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو آواز دیتے ہیں۔

آج بھی میں نہیں انسان سے مایوس کہ جب
لوگ کہتے ہیں خدا پر بھی بھروسہ نہ کرو

حفیظ میرٹھی کی فکر آئینہ کی طرح صاف اور سورج کی طرح روشن ہے' اس میں کہیں جھول نہیں' وہ مداہنت' منافقت اور خوشامد کو فن اور شخصیت کے لئے دیمک سمجھتے ہیں' وہ صراطِ مستقیم کے مسافر ہیں جس کے سنگِ میل یہ ہیں۔

کبھی جب امتیاز حق و باطل کا سوال آیا
ہمارے سامنے پھر اپنے بیگانے نہیں آئے

حفیظ صاحب کی شاعری کی سمت سفر متعین ہے' اس لئے ان کے یہاں پریشان خیالی' ژولیدہ بیانی اور آوارگی نام کو نہیں ملتی' ان کے لب و لہجہ کا وقار ان کے فکر کے اعتبار کا حصہ ہے' وہ عزم و اعتماد اور خودداری کے ساتھ سوئے منزل رواں رہتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں مقصدیت جوش و جذبہ میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے اور ان کا قاری بہت

جلد اپنے آپ کو اس سے مانوس کر لیتا ہے، جیسے یہ اس کے اندرون سے ابھری ہوئی صدا ہو۔

--ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، علی گڑھ

★

حفیظ میرٹھی کی شاعری کے حرکی عناصر کا خمیر عشق الٰہی سے اٹھا ہے جس کا دوسرا نام ایمان ویقین بھی ہے۔ یہ ایمانی قوت ہی اہل ایمان کو جمود سے الگ، حرکت بداماں رکھتی ہے، کیونکہ ایمان ایک مسلسل جنگ کا بھی محرک ہے، جو ایک طرف صاحب ایمان کو اپنے نفس کی کمزوریوں کے خلاف عمر بھر ابھارتا رہتا ہے تو دوسری طرف ناسازگار ماحول اور تیسری طرف باطل نظریات وافکار کے خلاف بھی مسلسل جنگ جاری رکھنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ مگر مرد خدا کے عشق کا جوش توازن اور ہوش کا پابند ہوتا ہے، اس لئے یہاں کسی ریڈیلزم یا تشدد کی گنجائش نہیں بلکہ بعض اوقات اسلامی تحریک کی ایک بڑی قوت اس کی "مظلومیت" بھی ہے کیونکہ بالآخر یہی مظلومیت چاروں طرف سے دوستوں کے علاوہ دشمنوں کے دل ودماغ کو بھی مسخر کرتی چلی جاتی ہے۔ ذیل کے چند اشعار میں حفیظ میرٹھی کے اس تحریکی مزاج کے محرک اول عشق کی صدر رنگ جلوہ سامانیاں ملاحظہ ہوں ؎

باخبر تھے عشق کے انجام سے
عشق کے انجام پر پچھتائیں کیا
عشق نہ جب تک روح رواں ہو
دل بھی ہے بے کار نظر بھی

--ڈاکٹر احمد سجاد، رانچی

★

تحریک ادب اسلامی سے متعلق غزل گو شعرا میں اپنی شبنم مزاجی، لہجے کی شائستگی، جذبے کی نرمی اور فکر کی پاکیزگی کے سبب حفیظ میرٹھی سب سے منفرد رہے۔ ان کی طبیعت کی مسکینی اور مزاج کی شگفتہ روئی بھی شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہو۔ ان کی شخصیت کی ہر دل عزیزی میں ان کی خندہ جبینی پیش پیش تھی۔ ان کی شخصیت کی چھوت ان کی شاعری پر پڑی۔ ان کے مزاج کے حسن نے غالباً اسی وجہ سے پھول کی

پنکھڑیوں پر اپنے فکر واحساس کو شعر کی صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے نظمیں نہیں کہیں یا بہت ہی کم کہیں۔ غزلوں کی ریزہ خیالی نے انہیں اور ان کی شخصیت کی درویشی نے غزلوں کو موہ لیا۔ اس پہلو سے عرشی بھوپالی 'انور صدیقی' عاصی کرنالی 'کوثر نیازی' ارشد کاظمی اور نعیم صدیقی سبھی سے وہ الگ رہے اور اپنی انفرادیت کے سبب شاید سب سے مقبول بھی۔

حفیظ کے بیشتر شعروں میں بلا کا تغزل ہے۔ رواں دواں' صاف و شستہ زبان میں پرکاری اور تاثیر کے جلوے جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ شائستگی اور پاکیزگی کا یہ حال ہے کہ غیر معیاری اور غیر شریفانہ لفظ سے تو وہ پہلو بچاتے ہی ہیں' طنز و تعریض میں بھی بے لگام نہیں ہو جاتے۔ کہنے کے انداز میں و جادلهم بالتي هي احسن کا مزاج ہے۔

--ڈاکٹر منظر اعظمی (مرحوم) دہلی

★

حفیظ کو دوسرے شاعروں کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ عوامی شاعر ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ان رکیک موضوعات کو نہیں چھوا ہے جن سے مشاعروں میں بڑی آسانی سے داد مل جاتی ہے' بلکہ خود ان کی زبان میں ؎

اے پرستاران نغمہ چھوڑ کر تارِ رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

رعنائیِ افکار و خیالات کا مطلب
عریانئ افکار و خیالات نہیں ہے

آسماں اس سے بہت دور ہے عظمت کا حفیظ
آشیاں فن کا نہ شہرت کے شجر پر رکھنا

رکیک موضوعات کے برعکس حفیظ میرٹھی نے اپنے اظہار کے لئے معروف انسانی اور اسلامی قدروں کا انتخاب کیا ہے' اور یہ انتخابِ موضوع خود ان کی عظمت پر دال ہے۔

فنی اعتبار سے حفیظ کے کلام میں پختگی اور بیشتر معروف صفات پائی جاتی ہیں۔ (ان کے) اشعار پڑھتے ہوئے فکر اور اسلوب بیان پر حفیظ کی مضبوط گرفت کا قائل ہونا پڑتا

ہے۔ بظاہر دیکھنے میں یہ چیز آسان معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بقول ناصر کاظمی ؎

کہتے ہیں غزل قافیہ پیائی ہے ناصرؔ
یہ قافیہ پیائی کوئی کرکے تو دیکھے

--ڈاکٹر سہیل احمد زیدی' الہ آباد

★

۱۹۴۷ء سے کچھ قبل اور متصل بعد کا کچھ عرصہ مسلمانانِ ہند کے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا۔ ان کی جان ہی خطرے میں نہیں تھی ان کا ایمان بھی نرغے میں تھا۔ شعر وادب کے میدان میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اشتراکیت کے دیو پیکر نقارے اتنے زور و شور سے بجائے جارہے تھے کہ ہر صدائے معتبر طوطی کی آواز بن کر رہ گئی تھی۔ مذہب رجعت پسندی' کم سوادی بلکہ ابلہی کی علامت ٹھہرایا جاچکا تھا۔ بالخصوص اسلام اور شعائر اسلام تنقیص و تضحیک کا ہدف تھے۔ ادبی قدروں اور سانچوں کی بے محابا شکست و ریخت اور انہدام قلمکاروں کا وطیرہ بن چکا تھا۔ سرخ انقلاب نے غزل کی صنف کو خاص طور سے لہو لہان کر ڈالا تھا۔ اقبال کو پیغمبر تو تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے لیکن شاعر نہیں۔ ہر وہ چھوٹا بڑا افکار جو رخش احمر پر سوار ہو گیا اس تیزی کے ساتھ گرم سفر تھا کہ منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی تھیں۔ اس دور ابتلا میں اسلامی ادب کی تحریک بہت ناتواں اور محدود تھی۔ چند سر پھرے تھے کہ اس زمانے میں بھی بقول اکبر الہ آبادی خدا کا نام لیتے تھے اور رقیب تھانے میں رپٹ لکھوانے کے بجائے براہ راست ان کے گریبانوں پر ہاتھ ڈالنے کے موقف میں تھے۔ عافیت کوش گوشۂ تنہائی میں جابیٹھے تھے اور شہرت کے خواہاں راگ درباری میں طبلے پر سنگت کر رہے تھے۔ تقریباً یہی زمانہ حفیظ کی اٹھان اور پہچان کا زمانہ ہے۔ اگر ان کی شخصیت میں کوئی جھول ہوتا تو وہ بھی ترقی پسندی کا ڈھول گلے میں ڈال لیتے۔ لیکن اس وقت عقیدے کی توانائی ان کے کام آئی اور انھوں نے بہ این ریشہ و ریش اسلامی فکر سے وابستہ و پیوستہ اور آراستہ و پیراستہ اشعار نہ صرف نظم کئے بلکہ بہ کمال جرأت و ہمت خصوصی مجالس سے لے کر عوامی اور سرکاری مشاعروں تک میں لحن بلالی کے ساتھ پڑھے اور خاص و عام سے داد و تحسین بھی حاصل کی۔

حفیظ کی شخصیت کے حوالے سے ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک

بہت دلچسپ پہلو سامنے آیا اور وہ یہ کہ اپنی غزلوں کے مقطعوں میں حفیظ اکثر و بیشتر خود مستحکم ہو جاتے ہیں اور اپنی شخصیت کے بہت سے گوشے خود بے نقاب کرتے ہیں۔ مومن سے تقابل مقصود نہیں لیکن مومن کے مقطعے اپنے تخلص کے موزوں اور برمحل استعمال کے باعث مشہور و منفرد ہیں۔ حفیظ اپنے تخلص کی لفظی یا معنوی رعایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ البتہ اگر کوئی شخص صرف ان کے مقطعے بغور پڑھ جائے تو اسے حفیظ کی شخصیت کے رنگ ڈھنگ، چھب ڈھب، رس جس اور کس بل کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

--شمیم عثمانی (مرحوم) دہلی

★

یوں تو ان کا کلام ان کی آواز اور ترنم (نیم سوز نیم قرأت، نیم کھرج میں) ایسے دلکش اور دل پذیر تھے کہ اہل نظر، بذلہ سنج اور ارباب ادب کے دل میں گھر کر لیتے تھے، ان کی غزلیات نہایت پاکیزہ و شستہ مذاق ادب کی حامل ہوتی تھیں۔

ان کا یہ شعر تو گزشتہ پچاس برس میں تمام اردو جاننے والوں کے دلوں پر نقش بن کر جاوداں ہو گیا جو زبان زد خاص و عام بن کر ہمیشہ یاد رہے گا۔

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

درمیانہ قد، بھرا بھرا جسم چوڑی موری کا غرارہ نما پائجامہ، سفید شفاف، چمک دار کرتا (ان کے کردار کی طرح بے داغ) اور شیروانی (اچکن) پاؤں میں جوتی یا گرگابی، ننگے سر، سیاہ و سپید کھچڑی نیم تراشی (یکمشت) داڑھی اور مسکراتا چہرہ ان کی محبوب شخصیت کا سراپا تھا۔ یہ ایک پرانی بحث ہے کہ بڑا فنکار اچھا انسان بھی ہو کبھی اچھا شاعر ہوتا ہے، یا اچھا شاعر کردار کی اخلاقی قدروں سے آزاد، پھر بڑا شاعر ہوتا ہے۔

خیر اس کا حتمی فیصلہ تو کبھی نہ ہو سکا۔ دنیا کے ہر ملک، ہر انسان اور ہر ادب میں یہ نزاعی موضوع ہمیشہ سے جوں کا توں قائم ہے مگر حفیظ میرٹھی کے بارے میں میں وثوق اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اچھے انسان بھی تھے اور اچھے شاعر بھی انہوں نے دونوں صورتوں کو تہذیب و شائستگی، کتاب و سنت، قال اللہ، قال الرسول اور صالحین و صدیقین کی تصویر کو ہمیشہ نظر میں رکھا۔ ان کی شخصیت بھی خوشبودار تھی اور ان کا

شعر و فن بھی۔

--گلزار دہلوی، دہلی

★

حفیظ میرٹھی ایک بڑے شاعر بھی تھے اور ایک مثالی انسان بھی۔ ان کے بارے میں یہ بات اکثر موضوع بحث رہی ہے کہ وہ انسان بڑے ہیں یا شاعر؟ لیکن میری معلومات کی حد تک ناقدین اس سلسلے میں کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔

حفیظ میرٹھی نے اردو غزل کی تمام صالح روایات کو جذب کر کے انہیں لطف تبسم دیا ہے۔

میرے خیال میں "ضرب الامثالیت" کی جو کیفیت ہمیں حفیظ کی شاعری میں ملتی ہے وہ کم از کم موجودہ صدی کے شعراء میں دو چار ہی کو نصیب ہو سکی ہو گی۔ حفیظ کے سیکڑوں اشعار ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور زبان زد خاص و عام ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کریں:

روشنی اتنی کب تھی مرے شہر میں
جل رہے ہیں مکاں مشعلوں کی طرح

زندگی اب ہماری خطا بخش دے
دوست ملنے لگے محسنوں کی طرح

لے کے نام خدا جان پر کھیل جا
بزدلوں میں نہ جا مشوروں کے لئے

ترے غم نے تپا کر رکھ دیا ہے
مجھے کندن بنا کر رکھ دیا ہے

ہم ضرورت اور انا کی کش مکش دیکھا کیے
بھیک ٹھکرایا کیے، دامن بھی پھیلا کیے

پاسباں آنکھیں ملے، انگڑائی لے، آواز دے
اتنے عرصے میں تو اپنا کام کر جاتی ہے آگ

نہ لے چل خانقاہوں کی طرف شیخِ حرم مجھ کو
مجاہد کا تو مستقبل ہے میدانوں سے وابستہ

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنی
گاتا جائے روتا جائے

مجھ کو ممنونِ کرم کر کے وہ فرماتے ہیں
آدمی سوچ سمجھ کر ذرا خوددار بنے

سانپ آپس میں کہہ رہے ہیں حفیظ
آستینوں کا انتظام کرو

--ڈاکٹر تابش مہدی، دہلی

★

شاعری ایک ایسا میدان ہے جس میں مشکل ہی کوئی شخص اپنا لوہا منوا سکتا ہے۔ یہ البتہ ہوتا رہتا ہے اور ہو رہا ہے کہ انجمنِ ستائش باہمی کے ذریعہ کچھ لوگ نمایاں ہو جاتے ہیں اور پھر اس انجمن کے زوال کے ساتھ ہی گوشہ گمنامی میں پہنچ جاتے ہیں، سوائے ان کے جنھوں نے انسانی اور آفاقی اقدار کو اپنی روح اور کلام میں جذب کر لیا ہو اور اپنے تاثر کو حسن بیان کے ذریعہ عوام تک منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں، اور حفیظ ایسے ہی گروہ میں شامل ہیں۔

--عبدالقدیر اصغر، کراچی

★

غزل کے بادشاہ نے کبھی ترقی پسندی اور جدیدیت کی زوال پذیر، مردہ، بے جان اور فرسودہ اصطلاحات کو اپنے لئے باعث افتخار نہیں سمجھا۔ نہ مجہول روایات کے پابند ہیں نہ بے جا بدعتوں کے روادار۔ وہ تو بے قید آزادی اور بے حیا عریانیت سے دور، مذاق سلیم اور شائستگی کے بل پر اپنے لئے ایک اعلیٰ معیار اور اچھوتی روش تجویز کر کے خودداری اور خود شناسی کے ساتھ اخلاق کے مسلمہ اصولوں اور اقدارِ حیات کی پاسداری میں مصروف ہیں۔ نعیم صدیقی کے الفاظ میں "غزل شفاف قسم کے ستر پردوں میں ایک ایسا جلوۂ صد رنگ ہے کہ ہر توضیح و تعریف اسے اور پیچیدہ معمہ بنا دیتی ہے اور کامیاب صرف وہ غزل گو ہے جو سمندر کی سطح پر سے نازک حباب کو لے اور سمندر کی تہ سے موتی نکال لائے اور اسے اس حباب میں نصب کر دے، بغیر اس کے کہ حباب ٹوٹے۔ حفیظ کامیاب غزل گو ہیں اور ان کی غزل "حباب میں رکھا ہوا گوہر نایاب"۔

میر و غالب و مومن کے بعد اکبر، اصغر، حسرت، جگر اور سیماب نے غزل میں مضامین نو کے انبار لگا دیئے۔ پھر اقبال نے غزل کے لئے نئی اقلیم دریافت کر لی۔ اقبال کے اثرات سے ہمنوا تو ہمنوا اکثر مخالف بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ احسان دانش، ماہر القادری اور حفیظ جالندھری نے اگر پاکستان میں اس کو آگے بڑھایا تو بھارت میں حفیظ میرٹھی بجا طور پر اس کے امین کہے جا سکتے ہیں۔ بلکہ حفیظ صاحب نے تحریکیت کو بھی جوش و مستی کے ساتھ غزل کا روپ دیا۔

حفیظ صاحب کی غزلیں حیات آگیں اور سرور بخش شعلہ و شبنم سے لبریز جام ہیں۔ رہروانِ راہ حق کے لئے چراغ طور حفیظ کے اشعار اس کثرت سے نظر آتے ہیں کہ اندھیرے کا گلہ باقی نہ رہے۔ عمیق و باوزن افکار، اپنے عہد کی بصیرتوں کا پختہ شعور، بنیادی اقدار حیات سے استوار تعلق، مقصد کی رفعت، فن کی پاسداری، والہانہ جوش و مستی، غزل کی ایمائیت اور رمزیت، حفیظ صاحب کے دامن غزل میں کیا کچھ نہیں ملتا!

--- مسعود جاوید ہاشمی، حیدرآباد

★

حفیظ کے انداز شاعری میں جو شائستگی، شگفتگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے اور لہجے میں جو رعنائی و طرحداری ملتی ہے وہ انہیں اپنے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔ ان کے یہاں

سادگی بھی ہے اور دل گداختگی اور وارفتگی بھی۔ ان کی شاعری میں شستہ، منتخب اور مترنم الفاظ کی ایسی حسین اور دلکش ترکیبیں ملتی ہیں جن کی نغمگی میں ہم کھو جاتے ہیں۔ حفیظ کا نغمہ ان کی آواز ہے اور ان کی آواز ان کا نغمہ ہے۔ ان کے کلام اور آواز کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

حفیظ کا احساسِ جمال بھی اقبال کے تصورِ حسن و عشق کی طرح احساسِ بندگی سے پیدا ہوتا ہے اور نکھرتا ہے۔ یہاں افلاطونی نظریہ محبت یا کروچے کے نظریۂ حسن کا انعکاس نہیں بلکہ یہ خالقِ کائنات کے تخلیقی مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگی سے ظہور میں آتا ہے۔ لذتِ بندگی میں ایک ایسا بھی مقام آتا ہے جب کائنات سمٹ کر ایک مرکز پر آجاتی ہے اور مقصدِ حیات ہی کیفیتِ عشق بن جاتا ہے۔ شیفتگی و وارفتگی، بے خودی و ہشیاری، سب اسی لذتِ بندگی کی وارداتیں ہیں۔

حفیظ میرٹھی کے یہاں اسلامی اقدارِ حیات کے واضح نقوش کے ساتھ ساتھ ہمیں خداپرستانہ انقلاب کی گونج بھی سنائی دیتی ہے اور ایک مثالی معاشرے کے قیام کی دعوت بھی ہے۔

جتنی شمعیں تھیں سب بجھ گئیں
روشنی دے چراغِ یقیں

--ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، بھٹکل (کرناٹک)

★

یہ وہ ستارہ سحری ہے جس کے نور سے آنکھیں چرانا ممکن نہیں۔

--رؤف خیر، حیدرآباد

★

حفیظ میرٹھی تقریباً نصف صدی سے چراغ شعر و ادب روشن کئے ہوئے ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ایک سچا فنکار حالات اور مشاہدات پیش کر رہا ہے۔ انھوں نے زمانے کی کروٹیں دیکھی ہیں۔ ان کے جذبے کی شدت ان کے اشعار میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ تحریک ادب اسلامی کے بے باک اور نڈر شاعر کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ وہ زبان و بیان پر قدرت بھی رکھتے ہیں اور اس کے اظہار کا موثر طریقہ بھی جانتے ہیں۔ وہ شاعری کی روایتوں کے امین بھی ہیں اور جدید عہد کے

تقاضوں سے ہم آہنگ بھی۔ ان کا کلام پڑھ کر روح کو طمانیت ملتی ہے۔

--اعجاز رحمانی، کراچی

★

اردو میں جب بھی بامقصد تعمیری اور اعلیٰ اخلاقی قدروں پر مبنی شاعری کی تاریخ مرتب کی جائے گی، حفیظ میرٹھی کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ادب کے ناقدین اسلامی ادب کے بارے میں خواہ کچھ بھی کہیں، ہمارے نزدیک بامقصد، تعمیری اور اعلیٰ اخلاقی قدروں پر مبنی شاعری ہی اسلامی شاعری ہے اور حضرت حفیظ میرٹھی اسی شاعری کے نمائندہ تھے۔ ان کی شاعری کا تعلق آزاد ہندوستان سے ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلم ملت ہمہ جہتی مسائل اور نامساعد حالات سے دوچار رہی ہے۔ نت نئے مسائل پیدا ہوتے اور کیے جاتے رہے۔ ان حالات میں جہاں ملت کی دینی و سیاسی قیادت اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کی کوشش کرتی رہی وہیں شعر و ادب کے محاذ پر ہمارے شعراء سرگرم رہے۔ لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ ملت کے مسائل، اس کے جذبات واحساسات، اس کی قوتِ ایمانی اور خودداری کو کون سے شاعر نے خالص اسلامی نقطہ نظر سے دنیا کے سامنے پیش کیا، تو کسی توقف کے بغیر حفیظ میرٹھی کا نام زباں پر آئے گا۔ ہر چند کہ دیگر تعمیر پسند شعراء بھی سرگرم رہے اور آج بھی ہیں لیکن حضرت حفیظ کو خصوصی مقام حاصل رہا۔ اپنے انداز بیاں کی وجہ سے وہ ادب اسلامی کے حلقے کے علاوہ دیگر حلقوں میں بھی بے حد مقبول تھے اور روایتی مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے مگر اس طرح کہ اپنا انداز کبھی نہیں چھوڑا نہ ہنگامہ پسند سامعین کی کبھی رعایت کی۔ افسوس کہ یہ صاحب طرز اور یگانہ روزگار شاعر ۷ رجنوری ۲۰۰۰ء کی شب ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا۔ اُٹھ تو گیا مگر اپنی شاعری کا ایک عظیم ورثہ چھوڑ گیا جس سے ہماری موجودہ اور آئندہ نسلیں فیض اٹھاتی رہیں گی انشاء اللہ۔

--پرواز رحمانی، دہلی

★

ایک صاحب جھجن کی دوکان پر تیسرے دن شیو کروانے آتے اور عصر کی نماز برابر کی مسجد میں ادا کرتے۔ جھجن سے معلوم ہوا کہ وہ کلکٹری میں ملازم ہیں اور شاعر ہیں۔ اس طرح حفیظ میرٹھی سے ۱۹۴۸ء میں میرا تعارف ہوا۔ اس وقت میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ ایک دن حفیظ صاحب نے جھجن کو ایک مشاعرہ میں آنے کی دعوت

دی اور بتایا کہ ”داستاں رکھتا ہوں میں“ مصرعِ طرح ہے۔ دوران گفتگو کہنے لگے آشیاں رکھتا ہوں میں اور گلستاں رکھتا ہوں میں کی بڑی مٹی خراب ہوگی۔ دوکان سے نکلتے وقت مجھے بھی شرکت کی دعوت دی۔ تقسیم ملک کے بعد انتہائی خوف اور مایوسی کے ماحول میں میرٹھ کا یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ مولانا قدرت میرٹھی کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ حفیظ صاحب کا اندازہ صحیح تھا' ہر شاعر آشیاں اور گلستاں رکھنے کا اعلان کر رہا تھا۔ حفیظ میرٹھی اسٹیج پر آئے' ان کا مطلع تھا ۔

ہر سکوں کی تہہ میں سو آتش فشاں رکھتا ہوں میں
ضبط کا اک رخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں

مشاعرہ کو جیسے کسی نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ہر شخص داد دے رہا تھا۔ مطلع پڑھتے پڑھتے حفیظ صاحب کا گلا خشک ہو گیا' پانی منگایا گیا' وہ ایک گھونٹ پانی پیتے اور مطلع پڑھتے' اس طرح ان کا گلا تو کچھ تر ہو جاتا لیکن حاضرین کی پیاس نہ بجھتی۔ مطلع مسلسل پڑھتے رہنے کے اصرار کو صاحبِ صدر نے بڑی مشکل سے روکا۔ حفیظ صاحب پڑھ رہے تھے ۔

اے پرستارانِ نغمہ چھوڑ کر تارِ رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

مشاعرہ کا عجیب عالم ہو گیا۔ غزل میں اس انداز کی بات اور ایسے اچھوتے قافئے! ایک انجانے فخر کے ساتھ مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی' مجھے خود اس شاعر نے مدعو کیا تھا جو یہ غزل سنا رہا ہے۔ میں نے سوچا' جیجن کی دوکان پر اتنا بڑا شاعر آیا کرتا ہے؟ حفیظ صاحب والہانہ ترنم سے پڑھ رہے تھے ۔

ہائے رے نیرنگیاں' ہوں تو چراغ اب بھی مگر
روشنی رکھتا تھا پہلے اب دھواں رکھتا ہوں میں

کیسی سچی بات کہی تھی حفیظ صاحب نے۔ تقسیم کے جانکاہ حادثہ کے بعد امت مسلمہ کی تصویر سامنے آگئی ۔

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان و گلستاں
آدمی ہوں' عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

آشیاں اور گلستاں کے قوافی میں کہے ہوئے تمام شعر بالکل پھیکے پڑ گئے' جب کہ

حفیظ صاحب مسلسل داد لے رہے تھے۔ یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا۔ اس طرح شاعروں کی اصطلاح میں حفیظ صاحب نے مشاعرہ لوٹ لیا۔

--رشید الدین احمد، میرٹھ

★

زندگی مقصد کے ساتھ جینے کا نام ہے۔ مقصد جتنا بلند ہوگا، زندگی بھی اتنی ہی اعلیٰ وارفع ہوگی۔ مقصد کے ساتھ گہرا ربط و تعلق قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ فکر و نظر کی صحیح بنیادیں ہمارے سامنے ہوں اور ہمارا زاویۂ نگاہ درست ہو، کیونکہ اس کے بغیر مقصد کے تعین کے باوجود مقصد حیات سے والہانہ تعلق قائم رکھنے میں ہم ناکام رہیں گے۔

آج کے اس فکری بے راہ روی کے دور میں صحیح فکر کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ آزادیٔ فکر اور آزاد خیالی کے نام پر فکر کی اصل اساس پر آج ضرب کاری لگائی جارہی ہے اور مقصد حیات کے صحیح فکر واساس پر یقین رکھنے والوں کو ''بنیاد پرست'' کہہ کر مطعون کیا جارہا ہے۔ پھر اس کے ساتھ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی ایک بھیڑ ہے جن کی نگارشات پر نظر ڈالیں تو آپ پائیں گے کہ نہ وہ صحیح اقدارِ حیات سے آشنا ہیں اور نہ انھیں کسی صحیح فکر واساس کی خبر ہے۔

اِس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اردو کلاسیکی غزل کے پاسدار، محافظِ اقدار، نامور شاعر حفیظ میرٹھی کے کلام کی اشاعت میرے نزدیک ادب واقدارِ حیات کی ایک اہم خدمت ہے۔

--ابو عمار رفیق احمد، حیدرآباد

★★

نعت

☆
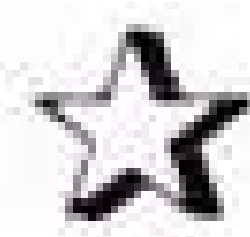
میسّر ہو اگر ایمانِ کامل
کہاں کی الجھنیں، کیسے مسائل

نہیں جن میں تمہارا عکس شامل
وہ نقشے ہیں مٹا دینے کے قابل

ثبوتِ عظمتِ انسانیت ہیں
محمدؐ مصطفیٰ انسانِ کامل

تمہارا ہر قدم شمعِ ہدایت
تمہارا نقشِ پا تصویرِ منزل

ہزار آزادیوں سے لاکھ بہتر
تمہارے عشق کے طوق و سلاسل

تمہارے قولِ فیصل سے ہوئی ہے
نمایاں خیر و شر کی حدِّ فاصل

سکوں مجھ کو نہیں درکار آقاؐ
بڑھا دیجے مری بے تابیِ دل

اجازت ہو تو شاہاؐ! پیش کر دوں
مرے پہلو میں ہے ٹوٹا ہوا دل

حفیظؔ اس عشقِ احمدؐ کی بدولت
مجھے ہے دولتِ کونین حاصل

☆☆

☆
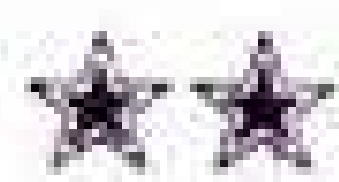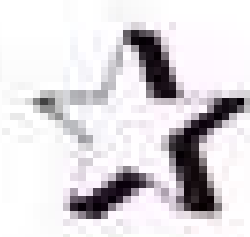
الجھنوں سے میں الجھتا رہا دن بھر آقاؐ
رات کو روؤں گا تنہائی میں کھُل کر آقاؐ

راہ کی ان کو خبر ہے نہ شعورِ منزل
قابلِ رحم ہیں اس دور کے رہبر آقاؐ

آپؐ کے نور سے منھ پھیر کے دنیا نہ چلے
ورنہ ہر گام پہ یہ کھائے گی ٹھوکر آقاؐ

آپ ہر طرح لطافت ہی لطافت ہیں حضورؐ
سایہ رحمتِ رب نور کے پیکر آقاؐ

فاصلوں میں نہ مساوات کہیں گم ہو جائے
اس لئے بیٹھتے تھے سب کے برابر آقاؐ

آپؐ کو وسعتِ کونین سے کیسے سمجھیں
وہ تو قطرہ بھی نہیں آپؐ سمندر آقاؐ

حملہ آور جو تھے باہر کے وہ سب ہار گئے
اس کا کیا ہو جو چھُپا ہے مرے اندر آقاؐ

ننگِ اسلام تھا لیکن یہ مری خوش بختی
مجھ کو مارا ہے مسلمان سمجھ کر آقاؐ

نعت کی فکر میں گھلتا ہے یہ ناچیز حفیظؔ
اس کی تخئیل کے طائر کو بھی شہپر آقاؐ

★★

☆
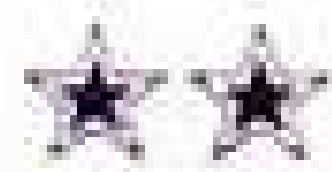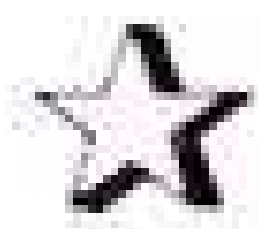
شاہوں کے بھی سرتاج غلامانِ محمدؐ
یارانِ محمدؐ تو ہیں یارانِ محمدؐ

تابندہ عقیدہ دیا تہذیب عطا کی
تاریخ نہ بھولے گی یہ احسانِ محمدؐ

اُس دور غلامی میں مساوات کی باتیں
اِس دور کا نعرہ ہے وہ اعلانِ محمدؐ

محدود نہیں ہے یہ مہ و سال و صدی میں
ہر دور کی آواز ہے اعلانِ محمدؐ

بے مثل صحیفے کی طرح سینۂ اطہر
جزدان کی مانند گریبانِ محمدؐ

ٹھکرا کے چلے قیصر و کسریٰ کے خزانے
اللہ غنی! ظرفِ گدایانِ محمدؐ

تسبیح و مصلاّ ہی نہیں تیغ و سپر بھی
اِس پر بھی ذرا غور شناسانِ محمدؐ

شب خون کی جرأت وہاں ظلمت کو نہ ہو گی
روشن ہے جہاں شمعِ شبستانِ محمدؐ

گھبرا کے مسلمان یہ کیا ڈھونڈ رہا ہے؟
کیا چھوٹ گیا ہاتھ سے دامانِ محمدؐ؟

راحت نے حفیظؔ اٹھ کے قدم میرے لئے ہیں
غربت میں بھی آسودہ ہے مہمانِ محمدؐ

★★

☆
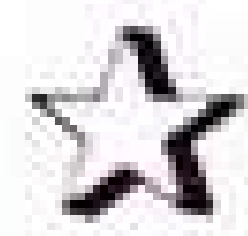
کیا بتائے کوئی مرتبہ آپؐ کا
مدح خواں ہے خدا، مصطفیٰ آپؐ کا

فتحِ مکہ تھی اک معجزہ آپؐ کا
کفر منہ دیکھتا رہ گیا آپؐ کا

رہبری ہے تو بس رہبری آپؐ کی
راستہ ہے تو بس راستہ آپؐ کا

امتِ مسلمہ کچھ مقامی نہیں
کائناتی ہے یہ دائرہ آپؐ کا

آپؐ کو قتل کرنے جو آیا تھا وہ
آپ کو دیکھ کر ہو گیا آپؐ کا

آج کی الجھنوں میں پھنسی زندگی
پوچھتی پھر رہی ہے پتہ آپؐ کا

دیکھ لو منہ کے بل گر پڑا وہ نظام
جو اڑاتا رہا مضحکہ آپؐ کا

ایک لمحہ نہ ٹھہریں گے جھوٹے نبی
نام تو لیجئے گا ذرا آپؐ کا

آپؐ کی نکتہ سنجی سے ایسا لگا
مسئلے مانتے ہیں کہا آپؐ کا

اک کسک اک تڑپ مانگتا ہے حفیظؔ
دے کے اللہ کو واسطہ آپؐ کا

★★

☆
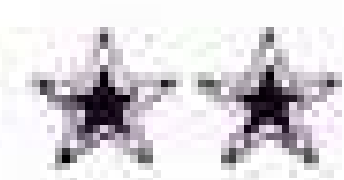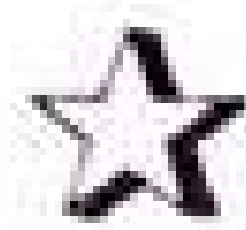
کہاں ملے گا زمانے کو اب قرار حضورؐ
ہَوس کے ہاتھ میں آیا ہے اقتدار حضورؐ

اسی لئے تو میں روتا ہوں زار زار حضورؐ
نہیں ہے میرے گناہوں کا کچھ شمار حضورؐ

یہ آرزو ہے کہ دیکھوں میں بار بار حضورؐ
وہ شہر آپؐ کا وہ آپؐ کا دیار حضورؐ

دیا ہے تحفہ یہ دنیا پرستیوں نے ہمیں
ہوئی ہے ذلّت و خواری گلے کا ہار حضورؐ

خدا کرے ہمیں توفیقِ اتحّاد ملے
ہمارا دشمنِ جاں ہے یہ انتشار حضورؐ

وہ چار یار ہوں یا پنج تن ہوں یا کچھ اور
ہے آپؐ کے سبھی پیاروں سے ہم کو پیار حضورؐ

گرا کے آپؐ نے ہر اونچ نیچ کی دیوار
بلند کر دیا انسان کا وقار حضورؐ

یہی جہاں میں نیا انقلاب لائے گا
پیام آپؐ کا پیغامِ نوبہار حضورؐ

خوشا کمالِ تعلّق زہے جمالِ نیاز
برائے امّتِ عاصی ہیں اشک بار حضورؐ

بچایئے اسے کملی کا ڈال کر سایہ
ہوا ہے جامۂ تہذیب تار تار حضورؐ

حیات و موت کی وہ کشمکش شبِ ہجرت
امانتوں کے رہے پھر بھی پاسدار حضورؐ

اسِ آسرے پہ کہ چشمِ کرم اٹھے اک بار
حفیظ میری زباں پر ہے بار بار حضورؐ

★★

☆
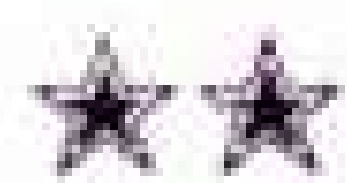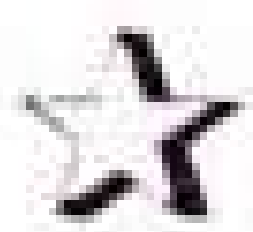
صرف تسبیح و مصلےٰ تک نہ تھی ذاتِ رسولؐ
کہہ رہی ہے صاف یہ تاریخِ غزواتِ رسولؐ

رہتی دنیا تک نمونہ ہے حیاتِ طیّبہ
اس لئے محفوظ ہیں حرف و حکایاتِ رسولؐ

جن کی طاعت میں نہیں گنجائشِ چون و چرا
ایک تو ذاتِ خدا ہے اور اک ذاتِ رسولؐ

مستند تفسیرِ قرآں سیرتِ پاک نبیؐ
اور صحابہؓ ہیں امینِ اکتساباتِ رسولؐ

مدرسوں اور خانقاہوں کو نہ جانے کیا ہوا
پھل ہی دیتے ہیں نہ سایہ اب یہ باغاتِ رسولؐ

فاصلہ طے ہو گیا پل بھر میں عرش و فرش کا
ہو گئی معراج میں حق سے ملاقاتِ رسولؐ

خود چھپاتے تھے عبارت کو وہی اہلِ کتاب
درج تھیں جن کی کتابوں میں علاماتِ رسولؐ

تاقیامت روشنی دیتے رہیں گے یہ چراغ
سیکڑوں صدیوں کا سرمایہ ہیں لمحاتِ رسولؐ

ہو گئے ناکام سب دانش کدے سب فلسفے
پھر بروئے کار آ ' درسِ مساواتِ رسولؐ

ان کے الطاف و کرم کا کیا ٹھکانہ اے حفیظؔ
ثبت ہے کونین پر مُہرِ عنایاتِ رسولؐ

★★

☆
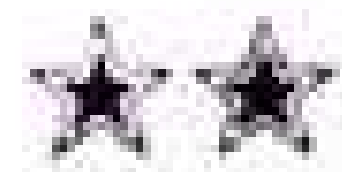
فکر و نظر کتابِ ہدایت کی دین ہے
حُسنِ عمل حضورؐ کی سیرت کی دین ہے

ملتی ہے فلسفوں سے کہیں دل کو روشنی
نورِ یقیں تو شمعِ رسالت کی دین ہے

کہنے کو چاہے جو کہیں احسان ناشناس
تہذیب کا وجود شریعت کی دین ہے

اس خوف پر زمانے کی بے خوفیاں نثار
جو خوف احتسابِ قیامت کی دین ہے

دل سے لگائے پھرتا ہوں داغِ فراق کو
یہ بھی تو آپؐ ہی کی محبّت کی دین ہے

ایمان کیوں عزیز نہ ہو جان سے ہمیں
یہ آنجنابؐ کے درِ دولت کی دین ہے

شاعر سمجھ کے یوں بھی نوازا حفیظؔ کو
سوز و گداز آپؐ کی فرقت کی دین ہے

★★

☆
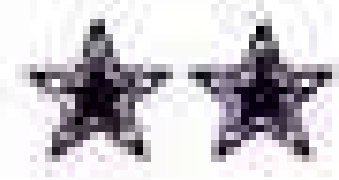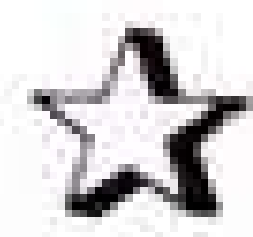
دوائے درد لے کر مرہم زخمِ جگر لے کر
رسولِؐ پاک آئے مصبِ خیرالبشر لے کر

برائے دشمنِ جانی بھی عفو و در گزر لے کر
رسالت آ رہی ہے پرچم فتح و ظفر لے کر

مہک اٹھی فضائے گلستاں انؐ کے پسینہ سے
چمک اٹھے ستارے انؐ کی خاکِ رہ گزر لے کر

غمِ الفت ہی سرمایہ ہے میری زندگانی کا
میں حاضرہوں حضوری میں متاعِ چشمِ تر لے کر

محمدؐ کے غلاموں کو یہ دنیا کیوں لبھاتی ہے
بھلا ہم کیا کریں گے بخششِ دریوزہ گر لے کر

ابد تک روشنی پھیلی ہوئی ہے راہِ ہستی میں
چراغِ آخرِ شب آ گیا نورِ سحر لے کر

حفیظؔ اکثر یہ نعمت نعت کی محفل میں ملتی ہے
اٹھے ہیں اہلِ دل آنکھوں میں اشکوں کے گہر لے کر

★★

☆
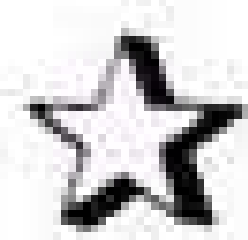
اسی سے نوعِ انساں پھر ہدایت کی سوالی ہے
وہ ہادیؐ جس نے دنیا' دین کے سانچے میں ڈھالی ہے

امید و بیم کی تصویر بن کر رہ گیا ہوں میں
نظر سوئے فلک ہے ہاتھ میں روضہ کی جالی ہے

ادب سے میں یہ موتی انؐ کے قدموں میں سجادوں گا
مری آنکھیں تو پُر ہیں کیا ہوا گر ہاتھ خالی ہیں

کسی بھی قیصر و کسریٰ کو خاطر میں نہیں لاتے
محمدؐ کے غلاموں کی ادا سب سے نرالی ہے

مٹانا چاہتے ہیں آپؐ کے قانون کو شاہا!
کچھ ایسے لوگ جن کا شیوہ حق کی پائمالی ہے

اندھیرے خود پریشاں ہیں یہ میرا کیا بگاڑیں گے
کہ میں نے شمعِ ایماں خانہ دل میں جلا لی ہے

حفیظؔ اب ہم نبیؐ کے ہجر میں آنسو بہائیں گے
نکلنے کی ہماری حسرتوں نے راہ پا لی ہے

★★

☆
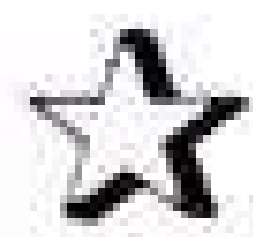
آپؐ کے نقشِ قدم کو جب سے چھوڑا ہے حضورؐ
ہم ہیں اور بڑھتا ہوا ذلت کا سایہ ہے حضورؐ

سرورِ عالم بھی ہیں اور شافعِ محشر بھی ہیں
دو جہاں میں آپؐ ہی کا بول بالا ہے حضورؐ

بے یقینی، بے ضمیری، عقل کی غارت گری
عصرِ حاضر میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے حضورؐ

کب سے کہتی ہیں زبانیں کب سے لکھتے ہیں قلم
آپؐ کی تعریف کا مضمون تشنہ ہے حضورؐ

سو گئے اہلِ عرب عیش و طرب کی چھاؤں میں
اب عجم شوقِ شہادت میں صف آرا ہے حضورؐ

کٹ مروں اے کاش میں بھی آپؐ کے ناموس پر
درد کا میرے یہی بس اک مداوا ہے حضورؐ

جب بھی آتی ہے صبا سمتِ مدینہ سے اِدھر
میں سمجھتا ہوں کہ میرا ہی بُلاوا ہے حضورؐ

روضۂ اطہر پہ اشکوں کا محرّک غم نہیں
یہ تو معراجِ مسرّت کا تقاضا ہے حضورؐ

ہم برا سمجھیں اسے توبہ ہماری کیا مجال
آپؐ نے اچھا کہا جس کو وہ اچھا ہے حضورؐ

آپؐ کی راہِ اطاعت سے گریزاں ہے حفیظؔ
اور زباں پر آپؐ کی الفت کا دعویٰ ہے حضورؐ

★★

☆
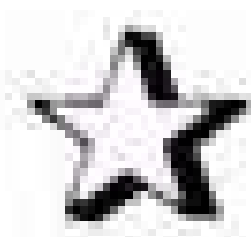
محترم خاندانِ نبیؐ
یار شایانِ شانِ نبیؐ

رہبروں کے بھی قبلہ نما
اے خوشا پیروانِ نبیؐ

باخبر، باعمل، باشعور
سارے دیوانگانِ نبیؐ

میرے اشکوں کو مل ہی گیا
آخرش آستانِ نبیؐ

سرنگوں اہلِ کبر و غرور
سرخرو عاجزانِ نبیؐ

خوں کے پیاسوں کو جامِ کرم
دنگ تھے دشمنانِ نبیؐ

شرم آتی ہے کہتے ہوئے
ہم ہیں وابستگانِ نبیؐ

جان پر کھیلنا ہے تمہیں
جان لو عاشقانِ نبیؐ

پا رہی ہے زباں اے حفیظؔ
لذّتِ داستانِ نبیؐ

★★

☆
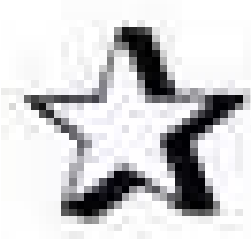
حق بات ہی یا رب مرے خامہ سے رقم ہو
اِس کے سوا لکھوں تو مرا ہاتھ قلم ہو

اک اشکِ ندامت میں ہے رحمت کا سمندر
برسے گا بہت ابرِ کرم آنکھ تو نم ہو

جب رسمِ مناجات ادا ہو چکی اے دل
لازم ہے کہ کچھ تذکرۂ شاہِ اممؐ ہو

عقبیٰ کا شعور آپؐ نے بیدار کیا ہے
دنیا تو یہ کہتی تھی کہ بس میرا ہی غم ہو

دولت کا نہیں سوزِ دروں کا ہوں سوالی
اس آگ سے خالی ہے عرب ہو کہ عجم ہو

ہم گِر گئے سرکارؐ زمانے کی نظر سے
کردار اگر ہو تو زمانے میں بھرم ہو

اس دور میں پہچان بھی گم ہو گئی اپنی
اب لوگ یہ پوچھیں ہیں کہ تم کون دھرم ہو

اللہ رکھے جوشِ عقیدت تو بہت ہے
اللہ کرے ہم میں اطاعت کا بھی دم ہو

تطہیرِ حرم تم نے اس انداز سے کی ہے
لگتا ہے کہ جیسے تم ہی معمارِ حرم ہو

مجھ کو بھی اشارہ ہو کہ آ تو بھی حفیظؔ آ
جب دستِ مبارک میں شفاعت کا علم ہو

★★

☆
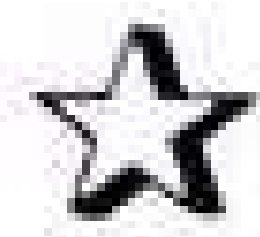
بحر و بر پر چھا گئی عظمت رسولؐ اللہ کی
مرحبا یہ شان یہ شوکت رسولؐ اللہ کی

پیروی باطل کی اور مدحت رسولؐ اللہ کی
کیا منافق ہوگئی امت رسولؐ اللہ کی

اہل ایماں پر ستم کی انتہا کرنے کے بعد
کفر نے تسلیم کی طاقت رسولؐ اللہ کی

لہلہا اٹھیں عرب میں دینِ حق کی کھیتیاں
فضل ہے اللہ کا محنت رسولؐ اللہ کی

بزمِ ہستی کے لئے شمعِ فروزاں بن گئے
جن صحابہؓ کو ملی قربت رسولؐ اللہ کی

اب مسلمانوں میں جانے کیوں نظر آتی نہیں
وہ حیا وہ شرم وہ غیرت رسولؐ اللہ کی

آپؐ کا ظاہر حسیں ہے آپؐ کا باطن حسیں
آئینہ ہے جلوت و خلوت رسولؐ اللہ کی

جس کا جی چاہے کسی رخ سے اٹھا کر دیکھ لے
کس قدر بے داغ ہے سیرت رسولؐ اللہ کی

کیا کرے گا مال و زر لیکر حفیظؔ میرٹھی
بخش دے یارب اسے الفت رسولؐ اللہ کی

★★

☆
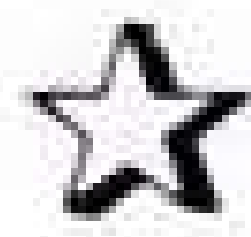
میں روزِ جزاء پر کبھی ایمان نہ لاتا
لیکن مجھے ارشادِ نبوّت کا یقیں ہے

خود فیصلہ فرما دیا محبوبِ خدا نے
انسان بس انسان ہے اللہ نہیں ہے

جنّت کی تمنّا مرے سرکارؐ نے کی تھی
کیسے کہوں جنت مجھے درکار نہیں ہے

☆

آنے دو نئے فلسفے بڑھنے دو ذرا علم
کچھ اور نکھر جائے گا عرفانِ محمدؐ

ناپاک شرابوں سے ہے بیزار جو شاعر
جانے دو اسے سوئے خمستانِ محمدؐ

کتنی ہی حفیظؔ آپ کریں نعت کی کوشش
ممکن ہی نہیں ہو سکے شایانِ محمدؐ

★★

غزلیات

☆
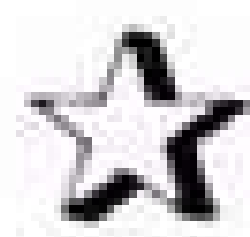
چاہے تن من سب جل جائے
سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

بحرِ محبت توبہ توبہ!
تیرا جائے نہ ڈوبا جائے

اے وائے مجبوریِ انساں
کیا سوچے اور کیا ہو جائے

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنی
گاتا جائے روتا جائے

دنیا کا اپنانا ہی کیا!
کانٹے اپنے پھول پرائے

عزّت دولت آنی جانی
مل مل جائے چھن چھن جائے

ظرف ہے یہ تو اپنا اپنا
کوئی بگاڑے کوئی بنائے

جس کو ہو کہنی دل کی کہانی
سرتا پا دھڑکن بن جائے

کاش ہمارا فرضِ محبّت
عیشِ محبّت پر چھا جائے

★★

☆
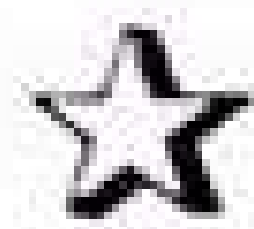
ہر سکوں کی تہ میں سو آتش فشاں رکھتا ہوں میں
ضبط کا اک رخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں

اے پرستارانِ نغمہ چھوڑ کر تارِ رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

ہائے رے نیرنگیاں، ہوں تو چراغ اب بھی مگر
روشنی رکھتا تھا پہلے، اب دھواں رکھتا ہوں میں

آج تک گزری اجل کی آرزو میں زندگی
زندگی سے آج بھی دلچسپیاں رکھتا ہوں میں

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان و گلستاں
آدمی ہوں، عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

مجھ سے کب ہوتی بھلا پابندیِ رسمِ وجود
ان کی دلداری کی خاطر جسم و جاں رکھتا ہوں میں

اب بھی وہ اپنا سمجھ کر مجھ کو اپنا لیں حفیظؔ
کون جانے ورنہ پھر یہ سر کہاں رکھتا ہوں میں

★★

☆

نہ شوخیوں سے نہ سنجیدگی سے ملتی ہیں
وہ لذّتیں جو تری برہمی سے ملتی ہیں

جب اس کے غم کے سوا زیست کچھ نہیں ہوتی
وہ ساعتیں بڑی خوش قسمتی سے ملتی ہیں

نہیں ضرور کہ قربت ہو وصل کا حاصل
کہ دوریاں بھی تو وابستگی سے ملتی ہیں

اگرچہ ترکِ تعلق کو ایک عمر ہوئی
وہ نظریں اب بھی اسی دلکشی سے ملتی ہیں

دلِ تباہ! مری بات کا خیال نہ کر!
ملامتیں بھی تو ہمدرد ہی سے ملتی ہیں!

نقابِ حسن کو جلووں سے مختلف نہ سمجھ
نظر کو دید کی راہیں اِسی سے ملتی ہیں

جو درد و غم کی طلب ہے سنو کلامِ حفیظؔ
یہ بخششیں کسی محروم ہی سے ملتی ہیں

★★

☆
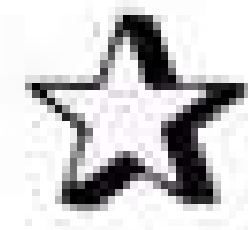
کس کس انداز سے فطرت نے مجھے خوار کیا
کہیں مجبور بنایا کہیں مختار کیا

نیم باز آنکھوں سے یہ کیا نگہِ یار کیا
نہ تو معصوم ہی چھوڑا نہ گنہگار کیا

میں تو اُس درد کے انجام سے تھرّاتا تھا
جس کے آغاز نے تم کو مرا غمخوار کیا!

ہائے مجبوریِ الفت کہ بایں سوز و گداز
ہم نے ہنس ہنس کے ترے عشق سے انکار کیا

وہی دیوانہ سا برباد سا شاعر سا حفیظؔ
تم نے بھی کس کے لئے دل کو گرانبار کیا

★★

☆
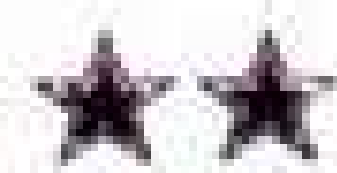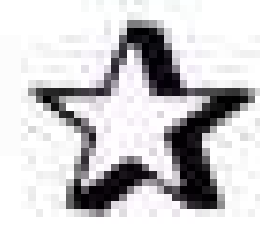
بجھا بجھا غمِ پنہاں سے وہ شباب رہا
اک آفتاب پسِ پردۂ سحاب رہا

دھڑکتے دل کی قسم آپ کے نہ آنے سے
تمام رات ستاروں کو اضطراب رہا

انہیں بُھلا کے تو کچھ اور ہو گئے برباد
ہُوا سکوں ہی میسر نہ اضطراب رہا

زباں تو پھر بھی زباں ہے نگاہ تک نہ اٹھی
مگر وہ شکوہ کہ اس پر بھی کامیاب رہا

شروعِ عشق کی ناکامیاں ارے توبہ
خود اپنے دل سے مجھے مدتوں حجاب رہا

جو اٹھ گئیں وہ نگاہیں تو کیا کرو گے حفیظؔ
پناہِ زہد میں اب تک تو یہ شباب رہا

★★

☆
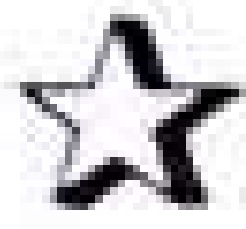
کب آپ کے ایسے وعدوں سے تسکین دلِ ناکام ہوئی
اک صبحِ قیامت یاد آئی جب کوئی پکارا شام ہوئی

کیا جانئے دل کو توبہ کی یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی
اسکے بھی کرم پر حرف آیا اپنی بھی خطا بدنام ہوئی

الفت کے تجلی پانے تک بے نور تھے حکمت کے جلوے
جب دشتِ جنوں میں صبح ہوئی زندانِ خرد میں شام ہوئی

بھڑکی ہوئی آگ دبائی بھی تو اٹھتا دھواں کب رکتا ہے
ہم ضبطِ فغاں کرتے ہی رہے اور دل کی حکایت عام ہوئی

اس غم میں حفیظؔ آخر کبتک چپ چپ سے کھوئے کھوئے سے
سودائے محبّت چھوڑو بھی اب اٹھو دیکھو شام ہوئی

★★

☆
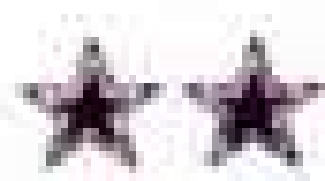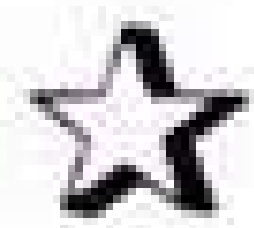
کتنے اہلِ ہوش کس کس طرح بہکانے اٹھے
آپ کے کوچہ سے اٹھنے تھے نہ دیوانے اٹھے

رنج و راحت کا وہ یوں مفہوم سمجھانے اٹھے
راہ میں کانٹے بچھا کر پھول برسانے اٹھے

وہ جو خالی کر کے میخانے کے میخانے اٹھے
آخرش ان مست نظروں کی قسم کھانے اٹھے

آج کی بدحال دنیا کے بھی دن پھر جائیں گے
اے مورّخ ہم اگر تاریخ دہرانے اٹھے

ظرفِ ساقی ہی نہ جب دیکھا تو پھر کیا بیٹھتے
آنسوؤں سے بھر کے ہم آنکھوں کے پیمانے اٹھے

غمگسار آئیں نہ آئیں بزم برپا ہو نہ ہو
دل جلوں سے دل جلے کہہ سُن کے افسانے اٹھے

اب خدا حافظ متاعِ دین و دانش کا حفیظؔ
واعظِ کج فہم بھی تقریر فرمانے اٹھے

★★

☆
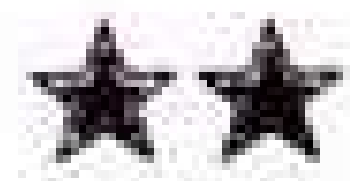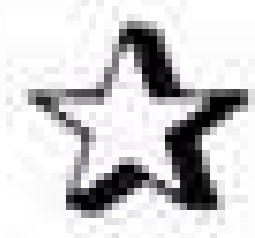
گاہ مٹتی ہے گہہ ابھرتی ہے
آرزو دل سے چھیڑ کرتی ہے

ان کی رنگینیاں سنبھل جائیں
اب مری سادگی سنورتی ہے

کھتی ہی رہتی ہے خودی جس کو
بے خودی وہ بھی کر گزرتی ہے

گڑ کے رہ بھی گئی حیا سے تو کیا
وہ نظر یوں بھی کام کرتی ہے

ہجر میں ہم تڑپ تو لیتے ہیں
کیا خبر ان پہ کیا گزرتی ہے

★★

☆
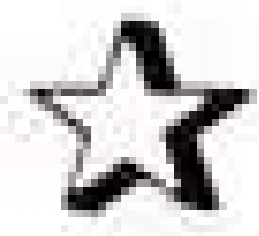
بے تابیاں ہیں اور نہ غمِ انتظار ہے
یہ اعتبار ہے کہ عدم اعتبار ہے

کیا عہد تھا کہ آپ کی نفرت بھی تھی عزیز
کیا وقت ہے کہ آپ کی الفت بھی بار ہے

سچ جان میں نے تیری تمنا کبھی نہ کی
اور یوں ترے کرم کا تجھے اختیار ہے

آپ اور دعائے مرگِ جوانی بہ چشم تر
کیا تلخیِ حیات بہت ناگوار ہے

کافر سُرورِ عشق تو تھا ہی مگر حفیظؔ
اس سے بھی کچھ لذیذ یہ ظالم خمار ہے

★★

☆
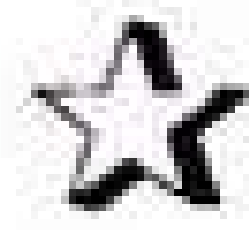
اُف رے شکایتِ جفا واہ رے شکوۂ ستم
ہنستے رہے حضور میں رو دیے دور جا کے ہم

دستِ ہوس میں سیف ہے جہل کے ہاتھ میں قلم
معرکۂ حیات میں رہ گئے خالی ہاتھ ہم

ہائے یہ کیا مقام ہے، ہائے یہ کیا نظام ہے
عشق کی آستیں بھی نم، حسن کی آستیں بھی نم

ایسا بھی انقلاب کیا، شیخ تمہیں یہ کیا ہوا
رخ تو ہے سوئے بت کدہ، پشت ہے جانبِ حرم

لاکھ ہم اہلِ درد سے دوست الگ تھلگ رہے
ہائے وہ زہر خند جو ہو کے رہا شریکِ غم

شاید اسی طرف سے کچھ لطف میں ہو گئی کمی
جانبِ کوئے دوست جو آج نہ اٹھ سکے قدم

★★

☆
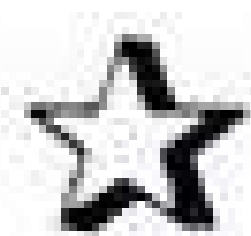
اُف تری بے نیازیاں پیہم
اٹھ گیا اعتبارِ دیر و حرم

ہائے وہ سادگیِ رنگا رنگ
ایک عالم میں سینکڑوں عالم

ان کی دزدیدہ پڑ رہی ہے نظر
اپنے لغزیدہ اٹھ رہے ہیں قدم

دیکھنا رنگِ روئے حسن حفیظؔ
عشق کی نبض ہو چلی مدّھم

★★

☆
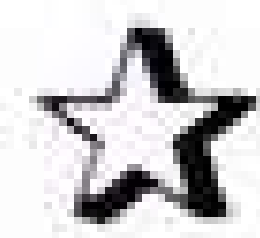
زہے طلب جستجو کی راہیں قدم قدم پر بدل رہے ہیں
سنبھل رہے ہیں بہک رہے ہیں، بہک رہے ہیں سنبھل رہے ہیں

کہاں وہ بزمِ ازل کے جلوے کہاں یہ دیر و حرم کے پردے
جمالِ رخ پر مچلنے والے نقابِ رخ سے بہل رہے ہیں

زہے گداز غم محبت، خوشا یہ آدابِ سوزِ الفت
نہ کچھ دھواں ہے نہ کوئی شعلہ بڑے سلیقے سے جل رہے ہیں

★★

☆
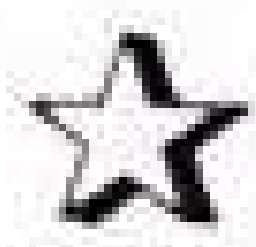
اس سے مجروح مرا ذوقِ الم ہوتا ہے
ظلم کرتا ہے جو مائل بہ کرم ہوتا ہے

اب قدم اہلِ جنوں ہی کو اٹھانا ہوگا
ہوش والوں میں تو یہ حوصلہ کم ہوتا ہے

ہائے اس انجمنِ ناز کے آداب جہاں
زور سے دل کا دھڑکنا بھی ستم ہوتا ہے

شکریہ آپ کے اس گوشۂ دامن کا مگر !
اشک شوئی سے کہیں درد بھی کم ہوتا ہے

★★

☆
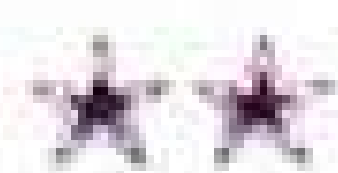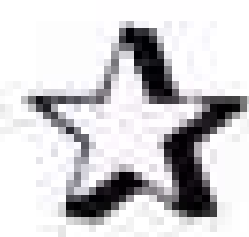
بیٹھنے بھی دے اب تُو اے جنوں ٹھکانے سے
باز آئے ہم تجھ کو راہبر بنانے سے

اب بھی یاد آتے ہیں ان کے یاد آنے سے
خواب کچھ سنہرے سے وقت کچھ سہانے سے

راہ طنز کرتی ہے روٹھ جاتی ہے منزل
کارواں جھجکتا ہے جب قدم بڑھانے سے

★★

☆
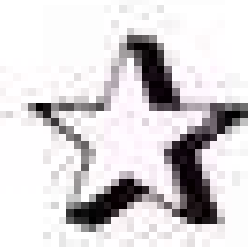
ہٹا ہٹا کے مقاماتِ این و آں سے مجھے
قریب کر دیا دل نے اس آستاں سے مجھے

حیات و موت کرشمے ہیں ان کی شوخی کے
کبھی یہاں سے پکارا کبھی وہاں سے مجھے

جوان کے منھ سے جھڑے تھے وہ پھول روک لئے
گلہ رہے گا یہ دامانِ کہکشاں سے مجھے

کہیں نہ موجبِ الزامِ ناسپاسی ہوں
یہ خوف ہے ترے الطافِ بیکراں سے مجھے

بتوں کے تحمّل کی حد ہو گئی خدا کی قسم
جواب تک نہ ملا ان کے آستاں سے مجھے

فرازِ ناز، نشیبِ نیاز، سطحِ گداز
تباہیوں نے پکارا کہاں کہاں سے مجھے

یہ پرخلوص فضائیں کہاں ملیں گی حفیظؔ
اٹھا نہ اہلِ محبّت کے درمیاں سے مجھے

★★

☆

بشر سے ہو نہ سکا دردِ زیست کا درماں
بہت وسیع ہے کہنے کو عالمِ امکاں

میں سن رہا ہوں تری دھڑکنیں مگر اے دل
غمِ جہاں سے الگ تو نہیں غمِ جاناں

ربابِ عیش و طرب پر غزل سرا شاعر
تلاشِ امن و سکوں میں حیات سرگرداں

کچھ اور ڈھونڈ رہی ہے نگاہِ اہلِ نظر
نہ گیسوؤں کی گھٹائیں نہ عارضِ تاباں

یہ ہلتے کانپتے، سطحی سے، ناتواں تنکے
ڈبو دئے انہیں تنکوں نے سینکڑوں طوفاں

دریدہ پیرہنی پر بھی فقر جامہ زیب
ہوس ہزار طرح کے لباس میں عریاں

شگفتگی بھی ہے تاثیر بھی، بصیرت بھی
پسند آئی تمہاری غزل حفیظ میاں

★★

☆
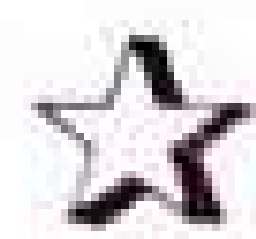
سوز نہ ہو تو سازِ حیات
صرف اک روکھی پھیکی بات

جل اٹھ جل اٹھ شمعِ یقیں
رات ہے اور اندھیری رات

آہ! یہ حسن کی نایابی
اف یہ جلوؤں کی بہتات

ان کا کھیل دل آزاری
اور مرے نازک جذبات

جان ہتھیلی پر رکھ لے
کہنی ہے گر سچی بات

معصوموں پر آئے ہیں
کیسے کیسے الزامات

کوئی ہنسے کوئی روئے
یہ اپنے اپنے حالات

نامحکم بنیادِ ہوس
عشق سراپا صبر و ثبات

☆☆

☆

کس جگہ بیٹھیں بھلا ہم چین سے آرام سے
کوئی گوشہ بھی نہیں خالی تمہارے دام سے

سہمی سہمی دھوپ سائے لرزہ براندام سے
کون ٹکرانے اٹھا یہ گردشِ ایام سے

اے گھٹا کہیو سلام شوق خاص و عام سے
میکشوں سے، مے سے، ساقی سے، سبو سے جام سے

جاں نثاروں کی وفا کا امتحاں لیتے ہیں آج
وہ جو واقف بھی نہ تھے کل تک وفا کے نام سے

ہل گیا مستوں کی ہاؤ ہو سے میخانہ مگر
ایک قطرہ بھی نہیں چھلکا کسی کے جام سے

کون کہتا ہے ہمارے دوستوں میں تھا حفیظؔ
کیا تعلق ہم کو اُس برباد سے بدنام سے

★★

☆
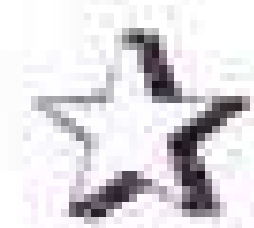
بے قرینہ ہو کے پھیکا پڑ گیا پھولوں کا رنگ
خار و خس ترتیب پا کر خوشنما سے ہو گئے

جانے کیا آیا حریمِ ناز و نعمت' سے جواب
جو سراپا شوق تھے بے مدعا سے ہو گئے

اٹھ گیا بالکل ہی جب عشق و ہوس کا امتیاز
ہم تری محفل سے دل برداشتہ سے ہو گئے

★★

☆
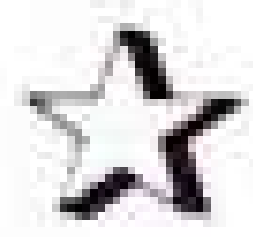
تواضع کر رہا تھا جب چمن خارِ مغیلاں سے
جنوں کا دستِ شفقت دور کیوں رہتا گریباں سے

گئے وہ دن رہا کرتے تھے ساحل پر بھی لرزاں سے
سفینے خود الجھنا چاہتے ہیں آج طوفاں سے

مری غمخوار دنیا کو بہت تکلیف ہوتی ہے
مرے غمگین چہرے سے مرے حالِ پریشاں سے

مری راہوں میں کانٹے ہیں مری منزل ہے شعلوں میں
کوئی کیوں باندھتا ہے اپنا دامن میرے داماں سے

★★

☆
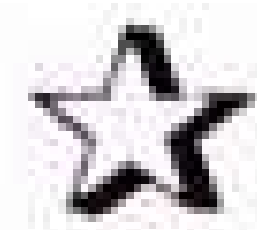
جایئے ہو کے بے قرار کہاں
سب ہیں غمگین، غمگسار کہاں

اب کے پھولوں میں وہ مہک ہی نہیں
لٹ گئی عصمتِ بہار کہاں

دیر کے پاس یا حرم کے قریب
ہم کریں تیرا انتظار کہاں

ہر گھڑی لب پہ ذکرِ یار تو ہے
دل میں ہر دم خیالِ یار کہاں

اُوپری مسکراہٹوں کی قسم
اٹھ سکا تیرے غم کا بار کہاں

ایک انداز پر رہے قائم
زندگی اتنی وضعدار کہاں

ہائے اس دورِ خود نمائی میں
پردہ داری بھی پردہ دار کہاں

درد ہی چین سے نہیں رہتا
دل میں گنجائشِ قرار کہاں

سہہ سکے بار آشیانے کا
شاخِ گل اتنی پائیدار کہاں

★★

☆
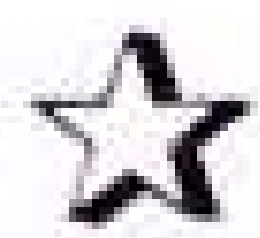
کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی

اب آدمی کا ٹھکانہ، نہ کائنات کی خیر
سنا ہے اہلِ خرد ہو گئے ہیں سودائی

ہزار حیف کہ ہم تیرے بے وفا ٹھہرے
ہزار شکر کہ ہم کو ہوس نہ راس آئی

اب اپنے جیب و گریباں کا کیا سوال رہا
جنوں کا ہاتھ بٹانے کو خود بہار آئی

حیات پوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم
تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی

اسی کی راہ میں آنکھیں بچھائے گی منزل
وہ عزم جو نہیں محتاجِ ہمت افزائی

مشاعروں میں حفیظؔ آج کل وہی جائے
کہ جس کو حد سے زیادہ ہو ذوقِ رسوائی

★★

☆
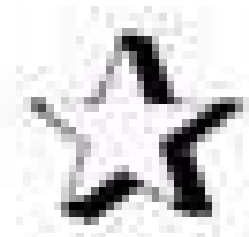
چھا جائے گی ماحول پہ کچھ اور اُداسی
بجھتی ہوئی شمعوں سے چراغاں تو نہ ہوگا

انسان کو انسان کا غمخوار بنا دے
اس دور سے یہ کارِ نمایاں تو نہ ہوگا

خود اُس نے کہا ہے تو اُسے کیوں نہ بھلا دوں
جاناں سے زیادہ غمِ جاناں تو نہ ہوگا

★★

☆
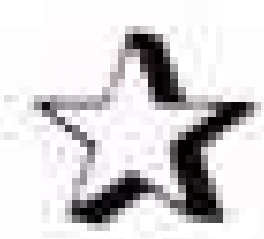
توجہ ہی انھیں جب دل پہ فرمانی نہیں ہوتی
کوئی شے بھی دوائے دردِ پنہانی نہیں ہوتی

نہ جانے اس زمین و آسماں کا حشر کیا ہوگا
جہانگیروں سے بھی یا رب جہاں بانی نہیں ہوتی

زباں بندی سے کب جذبات کا سیلاب رکتا ہے
حدودِ بحر کی پابند طغیانی نہیں ہوتی

ادائے فرض پر اہلِ وفا کا شکریہ کیسا
محبت میں تو قربانی بھی قربانی نہیں ہوتی

نہیں ہٹتا دھندلکا بدگمانی کا نہیں ہٹتا
نہیں ہوتی فضائے بزم نورانی نہیں ہوتی

کھلی آنکھوں سے میں نے معجزاتِ عشق دیکھے ہیں
خرد کے شعبدوں پر مجھ کو حیرانی نہیں ہوتی

ترے ماتھے کی شکنیں سرکشی کی داستانیں ہیں
دلیلِ عجز سجدوں کی فراوانی نہیں ہوتی

حفیظؔ اپنی زباں تو وقفِ اظہارِ حقیقت ہے
برائے غیرِ حق مجھ سے غزل خوانی نہیں ہوتی

★★

غزل
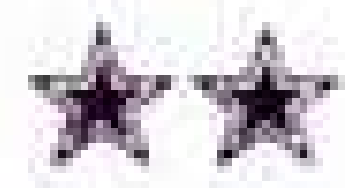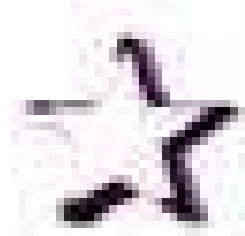
عقلِ آوارہ کہیں جہل بداماں تو نہیں
ہر نئے نظم سے بزم اور پریشاں تو نہیں

موجیں سمٹی ہوئی، سہمی ہوئی سہمے دریا
آج کشتی کوئی آمادۂ طوفاں تو نہیں

ابھی دیوانہ ہوں گا ابھی آئے گی بہار
ان کے دامن سے عزیز اپنا گریباں تو نہیں

[illegible] ہیں اور ابھی سامانِ سکوں ہیں لیکن
[illegible] کبھی پیماں ترا ساغر سرِ مژگاں تو نہیں

▲ ▲

☆
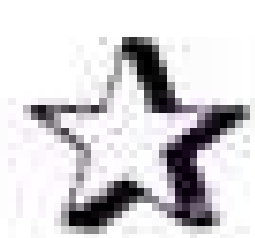
خرد کرتی حقیقت آشنا کیا
سوائے وہم اسکے پاس تھا کیا

محبّت کچھ تجارت تو نہیں ہے
دلِ ناداں وفاؤں کا صلہ کیا

کبھی تنہائی میں سُن دل کی آواز
رباب و چنگ و بربط کی صدا کیا

مجھے خود سے بھی دلچسپی نہیں اب
کسی کی بے نیازی کا گلہ کیا

حسیں خوابوں کی تعبیریں کہاں ہیں
محبت نے مجھے دھوکا دیا کیا

قدم جب رکھ دیا راہِ طلب میں
تو پھر کیفیتِ بیم و رجا کیا

چھپا جاتا ہے منہ ہاتھوں کے پیچھے
پشیمانی بھی ہے شرطِ دعا کیا

★★

☆
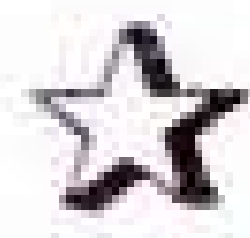
حسنِ جنوں نواز کا دیکھا جو التفات
مستی میں آ کے موت سے ٹکرا گئی حیات

اب وہ ترا خیال نہ بیزاریِ حیات
نفرت بھی بے ثبات محبّت بھی بے ثبات

اے محوِ انتظار ستارے نہیں ہیں یہ
ہنستی ہے تیری سادہ دلی پر اندھیری رات

بے مہریاں بڑھی ہیں زمانہ کی جس قدر
اُتنی ہی یاد آئی ہیں اُن کی نوازشات

جس سمت دیکھیے وہیں رِستے ہوئے سے زخم
ویسے بڑا حسین ہے دورِ ترقّیات

طے کیجیے گا دار پہ کہنا ہے کیا حفیظؔ
اک بزدلی کی بات ہے اک مردمی کی بات

★★

☆
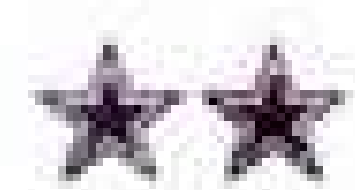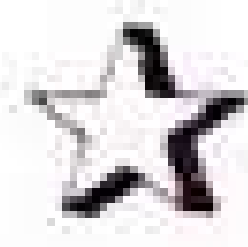
اپنی آنکھوں سے لہو اپنا جگر دیکھ لیا
جو کچھ آیا تری محفل میں نظر دیکھ لیا

ایک بار آیا تھا تعمیرِ نشیمن کا خیال
ہر طرف سلسلہ برق و شرر دیکھ لیا

اتنا ہی جانئے اس دور میں مفہوم سکوں
جان سی آگئی جب دوش پہ سر دیکھ لیا

جگمگانے لگے ذرّے تو ستارے نہ رہے
تیرا اندھیر بھی اے نورِ سحر دیکھ لیا

یہ دل و جان تو اک جام کی قیمت بھی نہیں
ہائے کیا ہوگا جو ساقی نے اِدھر دیکھ لیا

★★

☆
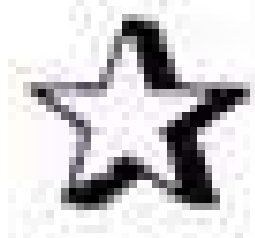
اک اشک مظہرِ صد اضطراب ہو بھی چکا
ستارہ رشکِ مہ و آفتاب ہو بھی چکا

دماغِ اہلِ سیاست پہ اعتبار نہ کر
دماغِ اہلِ سیاست خراب ہو بھی چکا

کُھلیں کہ بند رہیں راحتوں کے دروازے
حریم صبر میں دل باریاب ہو بھی چکا

قصوروار سزاؤں سے جب رہے محروم
شکستِ دل نے خبر دی عتاب ہو بھی چکا

اسی لئے تو یہ مضراب و تار روتے ہیں
حفیظ تارکِ چنگ و رباب ہو بھی چکا

★★

☆
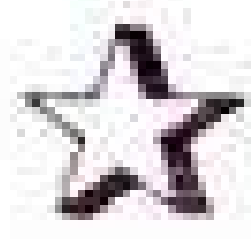
اس خلش کا کم سے کم اتنا تو درماں چاہیئے
ایک نشتر ہر نفس جزوِ رگِ جاں چاہیئے

ڈوب جائے گی یہ کشتی گر اسے ساحل ملا
زندگی کو ہر قدم پر ایک طوفاں چاہیئے

یہ فریبِ آب و گل ہے اس پہ کیا اٹھے گی آنکھ
روحِ گلشن چاہیئے، جانِ گلستاں چاہیئے

اور ہمّت ہو تو یہ پردہ بھی کر دے چاک چاک
سانس بھی کیوں درمیانِ جان و جاناں چاہیئے

وجد سا آنے لگا ہے اہلِ محفل کو حفیظؔ
تیرے بعد ایک اور تجھ سا ہی غزل خواں چاہیئے

★★

☆
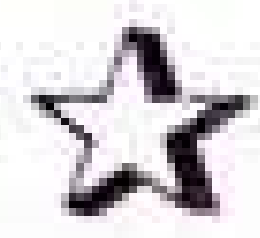
نظر پہ کیوں ہیں مناظرِ گراں نہیں معلوم
یہ رونقیں ہیں کہ ویرانیاں نہیں معلوم

خرد کی بات پہ ہنس کر گزر بھی جا اے دل
خرد کو فرقِ یقین و گماں نہیں معلوم

خبر نہیں کہ گرے ہیں کہاں کہاں آنسو
کدھر کدھر سے اٹھے گا دھواں نہیں معلوم

تمام راہ لہو میں ہے غرق اے منزل
کہاں تک آئے تھے سود و زیاں نہیں معلوم

خلوصِ عشق ذرا تُو ہی دیکھنا بڑھ کر
حجاب ہے کہ نظر درمیاں نہیں معلوم

حفیظؔ ہم تو روانہ ہوئے، خدا حافظ!
قدم اٹھائے گا کب کارواں نہیں معلوم

★★

☆
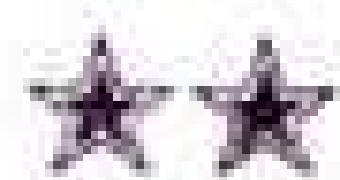
تیری مقدّس یاد بخیر، لاکھ ہو دورِ حرص و آز
عہدِ وفا نے روک لیا جب بھی ہوس نے دی آواز

کوئی کہاں تک جانے گا کوئی کہاں تک سمجھے گا!
دنیا کی محفل کا ہے ہر ذرّہ دنیائے راز!

لال نہیں ہے کس کا منہ اس دورِ خونخواری میں
جیسے جس کے بازو ہیں ویسی ہی اس کی پرواز

بلبل کے نغموں پہ نہ جا، گل کی رنگینی مت دیکھ
میرا فسانہ مجھ سے سن میں خود ہوں اپنی آواز

بزمِ طرب میں آج ذرا ہم بھی ہوئے تھے نغمہ سرا
لیکن اپنی چیخوں کی ساز سے کیا ملتی آواز!

★★

☆
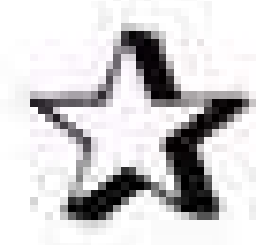
بربادیاں بھی عشق میں بے فائدہ نہیں
اب آس پاس اہلِ ہوس کا پتا نہیں

مقدور اگر دوا کا نہیں ہے دعا ہی کر
قسمت کا آسرا تو کوئی آسرا نہیں!

کافی ہے صرف اپنے پرائے کا امتیاز
اس دورِ بے بصر میں کچھ اچھا برا نہیں

اللہ رے اس غریب تمنّا کی بیکسی
دل بھی کبھی جسے پہچانتا نہیں

بانگِ جرس ہے قافلہ والوں کی ہر صدا
اور دور دور ذوقِ سفر کا پتا نہیں

تو اس سے بدگمان نہ ہو یہ ترا حفیظؔ
کتنا ہی بے نیاز سہی بے وفا نہیں

★★

☆
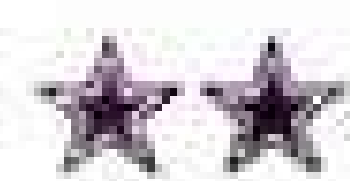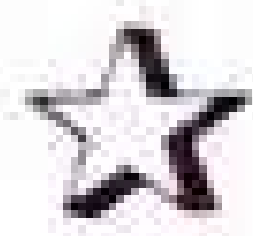
اگر دل سوزِ الفت کا امانت دار ہو جائے
تو ہر آتش کدہ گلزار ہی گلزار ہو جائے

عجب کیا ہے اسی ہمت شکن طوفاں کے پہلو سے
کوئی ایسی بھی موج اٹھے کہ بیڑا پار ہو جائے

جفا کاروں کے اس طرزِ جفا کی داد دیتا ہوں
ستم ڈھانے لگے کوئی، کوئی غمخوار ہو جائے

مغنی تیرے نغموں نے تو انساں کو سلایا ہے
مری چیخوں سے شاید آدمی بیدار ہو جائے

نہ ہو جو معترضِ باطل خداؤں کی خدائی پر
یہ مشکل ہے حفیظ اس قسم کا دیندار ہو جائے

★★

☆
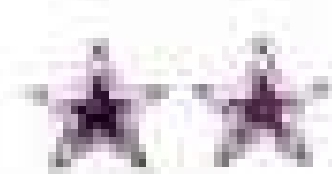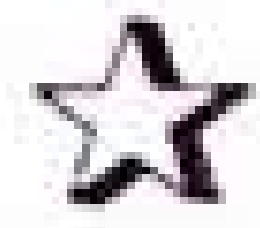
رشکِ فردوس! ہم اس سیر و سفر سے گزرے
دل لرز اٹھا وہ نظارے نظر سے گزرے

راہ روکے ہوئے خود راہنما بیٹھے ہیں
اب کوئی قافلہ گزرے تو کدھر سے گزرے

اُف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

حسنِ منزل کی قسم، زندگیِ دل کی قسم
رقص کرتے ہوئے ہم برق و شرر سے گزرے

جانے کیا کہہ گئے ماحول سے جاتے جاتے
وہ اندھیرے جو ابھی چاکِ سحر سے گزرے

کوئی چپکے سے دیا دل کا جلا کر سو جائے
کاروانِ مہ و انجم جب اِدھر سے گزرے

★★

☆
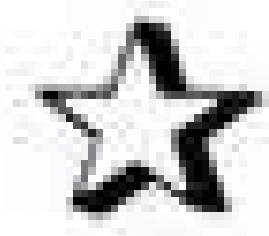
جب دیکھنے کی طرح سے دیکھا تری جانب
پردے بھی نمایاں ہوئے جلوے بھی نظر آئے

خاکے بھی نہ بن پائے ابھی اہلِ گماں سے
کچھ اہلِ یقیں خوں سے اُدھر رنگ بھی بھر آئے

اک عشقِ سبک سر ہی بَرِ دار ہے تنہا
اربابِ خرد آئے نہ اصحابِ نظر آئے

جب بھی کسی جانب سے ہوا ان پہ کوئی وار
ہو ہو کے شہیدانِ وفا سینہ سپر آئے

ہٹتی ہی نہیں اب ترے جلوؤں سے نگاہیں
آنکھوں کو بڑی دیر میں آدابِ نظر آئے

یہ وقتِ عمل اور یہ حفیظؔ آپ کی مستی
اچھی نہیں وہ نیند جو ہنگامِ سحر آئے

★★

☆
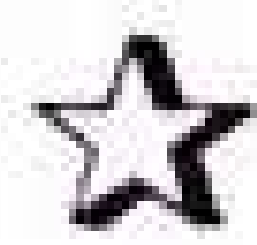
ہوا قدرداں اس قدر تو زمانہ
کہ جس کی سپر ہوں اسی کا نشانہ

بہت اس سے اونچی ہے پرواز میری
میں ہرگز نہیں بندۂ آب و دانہ

اس اک مرکزِ دین و دنیا سے ہٹ کر
نہ تیرا ٹھکانہ، نہ میرا ٹھکانہ

نہ پڑ ماضی و حال کی الجھنوں میں
صداقت نہیں ہے اسیرِ زمانہ

مجھے دوستی کی قسم دینے والے
مری دشمنی بھی نہیں دشمنانہ

کوئی مرحلہ ہو، کوئی معرکہ ہو
نظر عارفانہ، قدم غازیانہ

حفیظؔ اس میں شامل خلوصِ عمل ہے
نہیں شاعری یہ فقط شاعرانہ

★★

☆
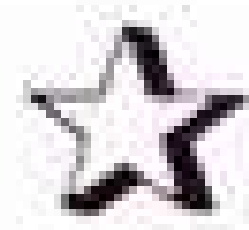
ہائے اس دوریِ منزل پہ یہ اندازِ خرام!
کارواں موجِ رواں سیلِ رواں ہو جاتا

یہ بھی اچھا ہوا تجھ پر نہ کھلا رازِ حیات
سانس کہتے ہیں جسے نشترِ جاں ہو جاتا!

پھر کوئی چیز نہ دنیا میں حقیقت رہتی
عشق سا واقعہ گر وہم و گماں ہو جاتا

مٹ گیا باغ سے ناموسِ خودی کی خاطر
گل کہاں رہتا جو ہمرنگِ خزاں ہو جاتا

جوہرِ فن بھی کوئی شے تھی نمائش کی حفیظؔ
تم عیاں کرتے نہ کرتے یہ عیاں ہو جاتا

★★

☆
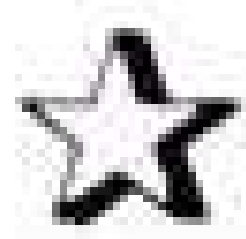
کہاں کے مالک و مختار ہم تو کچھ بھی نہیں
فریب دے نہ درِ یار ہم تو کچھ بھی نہیں

مری جھجک پہ وہ ساقی سے شیخ کا ارشاد
"بس اک یہی تو ہیں دیندار ہم تو کچھ بھی نہیں"

جب ان کے پاس گئے لیکے دردِ دل تو کہا
ہمیں نہ چھیڑیئے بیکار ہم تو کچھ بھی نہیں

ہر انقلاب تماشہ ہے بے دلوں کے لئے
نہ بے وفا نہ وفادار ہم تو کچھ بھی نہیں

کہاں وہ گرمیِ گفتار ہم ہی سب کچھ ہیں
کہاں یہ سردیِ کردار، ہم تو کچھ بھی نہیں

اِدھر جو چھاؤں سی دیکھی تو آکے بیٹھ گئے
لرز نہ سایہ دیوار ہم تو کچھ بھی نہیں

نکالنا تھا چمن سے حفیظؔ کو پہلے
یہی ہے واقعی اک خار ہم تو کچھ بھی نہیں

★★

☆

اخرش چوٹ کھا گئی دنیا
اپنی ہی زد میں آ گئی دنیا

آدمی نے کب آنکھ کھولی ہے
آہ جب مٹ مٹا گئی دنیا

رات کو رات کہہ دیا میں نے
سنتے ہی بوکھلا گئی دنیا

ساتھ چلنا تو خیر مشکل تھا
روکنے سے بھی کیا گئی دنیا

ٹھوکریں دربدر کی کھا کھا کر
ان کے قدموں میں آ گئی دنیا

تجھ سے پھیرا تری قسم دے کر
کیا کروں بھید پا گئی دنیا

کس نے سمجھا ہے میرے غم کو حفیظؔ
گدگدا کر رُلا گئی دنیا

☆☆

☆
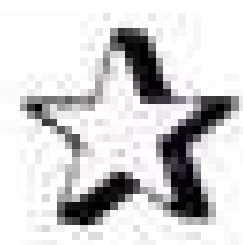
کیسی ہی مصیبت ہو بڑے شوق سے آئے
کم ظرف کے احسان سے اللہ بچائے

اب تک دئے جاتے ہیں دلاسوں پہ دلاسے
وہ جھوٹے سہارے جو کبھی کام نہ آئے

میں آج نئے عزم سے پر تول رہا ہوں
کوئی مری پرواز کی راہوں میں نہ آئے

پھولوں کو تو سر خوب چڑھاتا ہے زمانہ
ہے کوئی جو کانٹوں کو بھی سینہ سے لگائے

دامن کا کبھی غم ہے، کبھی فکرِ گریباں
ہم ہوش میں آئے بھی تو کیا ہوش میں آئے

جس شاخ نے آغوش میں کلیوں کو کھلایا
اس شاخ نے پھولوں کے جنازے بھی اٹھائے

رہتا ہے حفیظؔ اہلِ تکبّر سے گریزاں
اس شاعرِ مغرور کو منھ کون لگائے

★★

☆
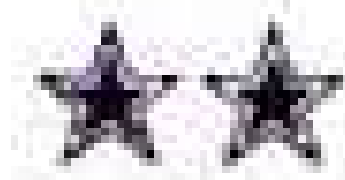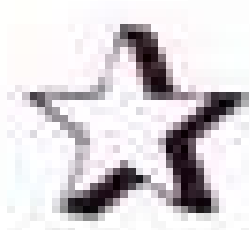
بلبل ہی کوئی مائلِ آہ و فغاں ملے
گلشن میں زندگی کا کہیں تو نشاں ملے

ہاتھ آ گئے جو چاند ستارے تو کیا ہوا
اس آستاں کی خاک کے ذرّے کہاں ملے

اے کاش میرے اجڑے نشیمن کے سامنے
خاموش سر جھکائے ہوئے باغباں ملے

اللہ رے بہار کی یہ چیرہ دستیاں
دامن یہاں ملے تو گریباں وہاں ملے

چھوٹوں سے یوں بڑوں کو تکبّر نہ چاہئیے
جھک کر ملے زمیں سے اگر آسماں ملے

اے دل ہجومِ غم میں غنیمت ہے بے کسی
چیخیں نکل پڑیں جو کوئی مہرباں ملے

آئی تھی قہقہوں کی صدا دور سے حفیظؔ
دیکھا قریب جا کے تو آنسو رواں ملے

★★

☆
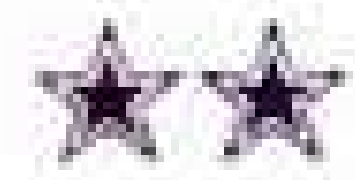
جنونِ شوق سے جب کام جھنجلا کر لیا میں نے
حوادث کو ہم آہنگِ تمنّا کر لیا میں نے

الٰہی کون سی منزل ہے یہ دنیا پرستی کی!
کسی نے نام پوچھا اور سجدہ کر لیا میں نے

نہ ہوں حیران میرے قہقہوں پر مہرباں میرے
فقط فریاد کا معیار اونچا کر لیا میں نے

خزاں کے خوف سے پھولوں نے شکلیں تک بدل ڈالیں
ادھر رنگِ قبا کچھ اور گہرا کر لیا میں نے

کبھی ایسی بھی رت لائے گی فطرت باغِ عالم میں
کہ جب جس شاخ پر چاہا بسیرا کر لیا میں نے

اِدھر آ تجھ سے رازِ سوز و سازِ زندگی کہہ دوں
رگوں میں خون' دل میں درد پیدا کر لیا میں نے

رسا ہوں یا نہ ہوں نالے' یہ نالوں کا مقدر ہے
حفیظ آنسو بہا کر جی تو ہلکا کر لیا میں نے

★★

☆

یہ کمالِ سادگی ہے کہ مقامِ بے نیازی
ترا کھیل سنگ باری، مرا کام شیشہ سازی

کوئی ہوش سے گریزاں، کوئی جوش سے گریزاں
وہ جنوں کی حیلہ سازی، یہ خرد کی حیلہ سازی

تری تیغ خوں سے رنگیں، تری لاش خوں سے رنگیں
بایں واقعاتِ خونیں نہ شہید تو نہ غازی

وہ تباہِ زورِ بازو، یہ خرابِ رسمِ تقویٰ
کہ عجم ترا سپاہی، تو عرب ترا نمازی

یہ خلوص ہی کی نعمت ہے شریعتوں کی عصمت
جو یہ ہو تو دین داری، یہ نہ ہو تو دین بازی

میں قدامتوں سے توبہ تو ہزار بار کرلوں
مگر اِس جدیدیت کا کوئی وصفِ امتیازی

کبھی فخرِ میکدہ تھے جو وہی حفیؔظ صاحب
سرِ بزم دینے آئے ہمیں درسِ پاکبازی

★★

☆
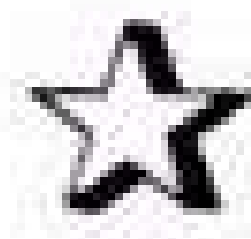
دور ہوتی جا رہی ہے منزلِ انسانیت
جانے یہ دنیا ہے کس کافر کی بھٹکائی ہوئی

ہر گھڑی عہدِ محبّت، ہر نفس پاسِ وفا
بیڑیاں یہ بھی ہیں لیکن اُن کی پہنائی ہوئی

ہو گئی شاید مسرّت کی حقیقت بے نقاب
ہر مغنّی کی صدا ہے آج بھرّائی ہوئی

کتنا اونچا ہے زمانہ کا یہ معیارِ خلوص
قصرِ گمنامی سے ہم نکلے تو رسوائی ہوئی

میری جانب سوچ کر بڑھنا ذرا اہلِ کرم
ہاں یہ دنیا ہے اِسی سائل کی ٹھکرائی ہوئی

★★

☆
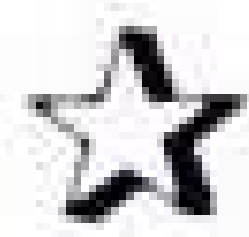
کسی جبیں پر شکن نہیں ہے کوئی بھی مجھ سے خفا نہیں ہے
بغور میرا پیام شاید ابھی جہاں نے سنا نہیں ہے

سلام کی جرأتیں نہیں ہیں نگاہ کا حوصلہ نہیں ہے
اگر وہ قسمت سے مل گئے ہیں تو اب ہمارا پتا نہیں ہے

غلط ہے تیرا خیال اے دل، سمجھ نہ اتنا بھی اسکو غافل
یہ درد میں دلکشی سی کیوں ہے اگر وہ درد آشنا نہیں ہے

سفینہ عہدِ نو پہ چھایا ہوا ہے بہروپیوں کا لشکر
یہاں ہر اک ناخدا نما ہے مگر کوئی ناخدا نہیں ہے

خیال کے دیوتا بھی جھوٹے عمل کے اندھے خدا بھی جھوٹے
خرد بھی فریاد رس نہیں ہے جنوں بھی مشکل کشا نہیں ہے

ہر ایک میکش کے ظرف سے باخبر ہے کتنی نگاہِ ساقی
کسی کو ہے حکمِ جاں نثاری، کسی کو اذنِ وفا نہیں ہے

کہاں کا شاعر خدائے شعر و سخن بھی ہم اسکو مان لیتے
حفیظ میں یہ بڑی کمی ہے کہ بندۂ خود نما نہیں ہے

★★

☆
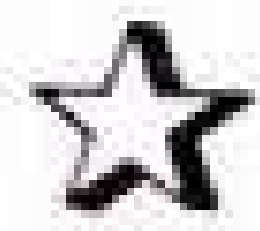
کارواں چاہے مختصر ہو جائے
کوئی رہزن نہ ہم سفر ہو جائے

خام اب بھی نہیں ہے عشق مگر
چوٹ کھالے تو پختہ تر ہو جائے

بارِ مرہم بھی زخم پر منظور
تاکہ تسکین چارہ گر ہو جائے

اس فریبِ سکون و راحت پر
اتنا ہنسیے کہ آنکھ تر ہو جائے

ہو نہ تقدیر کا اگر قائل
آدمی، آدمی کے سر ہو جائے

دھڑکنیں ہیں اب اہلِ دل کا پیام
سننے والا قریب تر ہو جائے

سچ ہے اچھا نہیں کلامِ حفیظؔ
کاش تو صاحبِ نظر ہو جائے

★★

☆
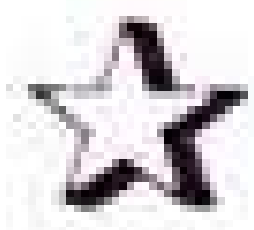
بالآخر جان دے کر جستجو کا حق ادا کرتے
بہت نزدیک تھی منزل اگر کچھ حوصلہ کرتے

یہ اپنی تنگ ظرفی ہے کہ ہم خود بھی نہیں اپنے
زمانہ اپنا ہو جاتا اگر آغوش وا کرتے

سکوں اب خود فریبی میں نہ کچھ عالم فریبی میں
حقیقت آشنا ہوتے حقیقت آشنا کرتے

عجب کیا تھا اسی میں سے دوا بھی کوئی مل جاتی
ابھی کچھ اور دردِ زندگی کا تجزیہ کرتے

حفیظؔ اب مرحبا کے شور سے تسکین نہیں ہوتی
کبھی نقد و نظر سے بھی غزل کو آشنا کرتے

★★

☆
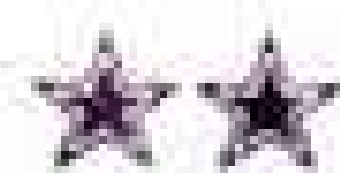
دلائل کی ترازو میں خدا کو تولنے والے
مجھے اتنا ہی سمجھا دے بشر کیوں ہے بشر کیا ہے

سفر ہی ابتدا میری، سفر ہی انتہا میری
مسافر ہوں مجھے اندیشہ شام و سحر کیا ہے

دھندلکوں سے بھی گزرا ہوں اندھیروں سے بھی گزرا ہوں
مرے اللہ یہ تاریکیِ قلب و نظر کیا ہے

یہ محفل ہے یہاں شمعیں تو گل ہوتی ہی رہتی ہیں
مگر اے ہم نفس یہ رخصتِ سوزِ جگر کیا ہے

★★

☆
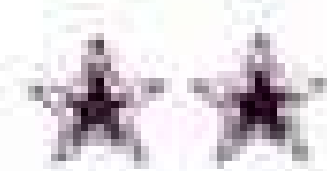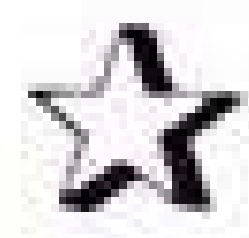
کسی صورت نمودِ زندگی کی راہ تو نکلے!
کوئی طوفاں ہی برپا کر اگر ساحل نہیں ملتا

تساہل باعثِ رسوائیِ فکر و نظر بھی ہے
جہاں کل تھا وہاں اب جادۂ منزل نہیں ملتا

اگر توفیق ہو اک مرگِ بامقصد کی خواہش کر
دواؤں کے ذخیروں سے سکونِ دل نہیں ملتا

کہاں تک کام دے گا زیر و بم بے روح نغموں کا
حُدی خواں سے مزاجِ ناقہ محمل نہیں ملتا

★★

☆
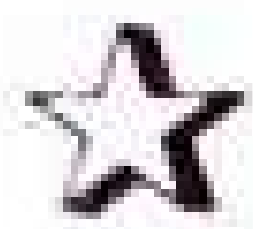
ہمّت کو ہی جب سلسلہ جنباں نہیں دیکھا
پھیلا ہوا پھر عالمِ امکاں نہیں دیکھا

کیا پردہ دری اس سے ہو اسرارِ جنوں کی
چھو کر بھی کبھی جس نے گریباں نہیں دیکھا

مانگا کئے دنیا کے اندھیروں سے اجالا!
اور اپنا چراغِ تہِ داماں نہیں دیکھا

اے عصرِ رواں تیرا جہاں روشن و تاباں
سب کچھ یہاں دیکھا مگر انساں نہیں دیکھا

گاتا ہے حفیظؔ آج بھی آزاد ترانے
گستاخ نے شاید درِ زنداں نہیں دیکھا

★★

☆
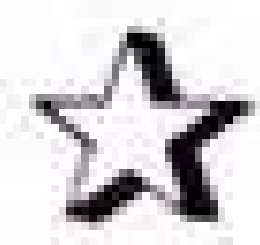
سر پھرے باندھے ہوئے سر سے کفن پھرتے ہیں
کجکلاہی کی ہے کچھ فکر نہ پگڑی کا خیال

جھڑکیوں پر بھی نہ مایوسِ کرم ہوتے ہم
بیچ میں آ گیا ناموسِ گدائی کا سوال

آج بھی پھرتے ہیں آنکھوں میں وہ ماضی کے نقوش
ہم سے میخانے کا دیکھا نہیں جاتا یہ حال

آ نہ جائے کوئی دھبّہ ترے دامن پہ کہیں
شیخِ خوش پوش گنہگاروں پہ کیچڑ نہ اچھال

★★

☆
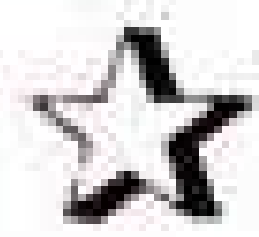
کئی منزلیں تراشیں کئی کارواں بنائے
جو سفر کا نام آیا مرے پاؤں ڈگمگائے

وہ طلب بھی کیا طلب تھی وہ کشش بھی کیا کشش تھی
تری سمت یوں بڑھے ہم نہ خود اپنے ہاتھ آئے

کہیں کلفتوں کا رونا کہیں غفلتوں کا رونا!
کسی راستے میں کانٹے کسی راستے میں سائے

نہ اطاعتیں گزاریں نہ محبّتیں نباہیں
نہ خدا کے کام آئے نہ بتوں کے کام آئے

وہی میری بے کسی پر لگے ہنسنے دور ہٹ کر
جو وفا کا عہد کرتے مرے ساتھ ساتھ آئے

لو وہ بزمِ دوست میں بھی نہ نبھے حفیظؔ صاحب
کوئی ایسے نکتہ چیں کو بھلا کیسے منھ لگائے

★★

☆
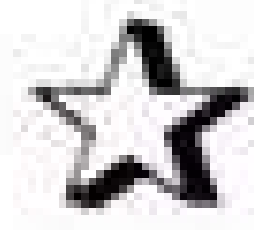
اثر کیا خاک ہوگا اسکی باتوں کا زمانے پر
جو خود اک مستقل تنقید ہو اپنے فسانے پر

کہاں کا ناخدا، کیسے سفینے، دست و بازو کیا
خدا ہی یاد آتا ہے سہارے ٹوٹ جانے پر

ہزاروں ٹھوکروں میں جستجوئے مرگ کرتے ہیں
وہ جن کو زندگی ملتی تھی تیرے آستانے پر

مسلسل نامرادی کا نتیجہ اور کیا ہوتا
محبّت طنز بن کر رہ گئی آخر زمانے پر

معاف اے نوگرفتارو، مرے پر نوچنے والے
مجھے مجبور کرتے تھے قفس کا در سجانے پر

میں کیوں اہلِ جہاں کی ترش روئی کا برا مانوں
گراں خوابی میں جھنجلایا ہی کرتے ہیں جگانے پر

☆☆

☆
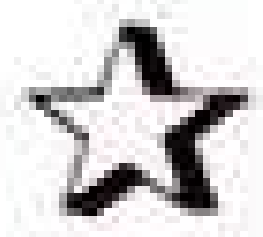
یہی اک سبق دیا ہے مجھے مسلکِ وفا نے
کہ میں جاں کو جاں نہ سمجھوں جو ترا کہا نہ مانے

ترے عشق کے تقاضے کسے جائیں ہم بتانے
کہیں مستیوں کے حیلے کہیں ہوش کے بہانے

بھلی رہنمائیاں ہیں بھلی ناخدائیاں ہیں
وہی رخ قرار پایا جو بتا دیا ہوا نے

انھیں زینتِ چمن میں کوئی کیوں شمار کرلے
ابھی برق کے بھی قابل نہ ہوئے جو آشیانے

بایں انقلابِ ہردم، بایں ارتقائے پیہم
ترے نقشِ پا سے آگے نہ پہنچ سکے زمانے

انہیں غم کے موڑ پر بھی نہ ٹھہرنے دے مغنی
حدِ نشۂ طرب سے تو گزر گئے ترانے

★★

☆
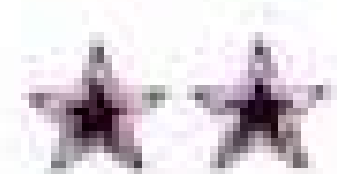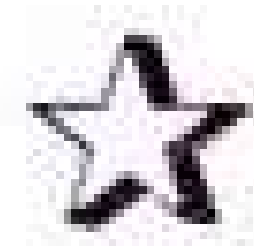
اس عزم میں عظمت کی کوئی بات نہیں ہے
جو عزم کہ پروردۂ آفات نہیں ہے

کچھ اوک سے پیتے ہیں تو کچھ جام بکف ہیں
ساقی تری محفل میں مساوات نہیں ہے

اب کُھل کے کہو بات تو کچھ بات بنے گی
یہ دورِ اشارات و کنایات نہیں ہے

ہوتی ہے مقام رسن و دار سے حاصل
یہ زندہ دلی بجنسِ خرابات نہیں ہے

رعنائیِ افکار و خیالات کا مطلب
عریانیِ افکار و خیالات نہیں ہے

ملتے ہی کچھ اس طرح اُمڈ آئے ہیں آنسو
جیسے کہ یہ رخصت ہے ملاقات نہیں ہے

جُھک جُھک کے حفیظؔ آپ نہ آداب بجا لائیں
یہ دادِ سخن ہے کوئی خیرات نہیں ہے

★★

☆
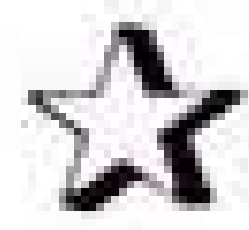
نہ جانے کتنے دل، کتنے جگر خوں ہو گئے ہوں گے
زبانوں پر یونہی الفت کے افسانے نہیں آئے

گلوں سے داغ، کانٹوں سے خلش لینے کو آئے ہیں
گلستاں میں ہم اپنے دل کو بہلانے نہیں آئے

کبھی جب امتیازِ حق و باطل کا سوال آیا!
ہمارے سامنے پھر اپنے بیگانے نہیں آئے

ابھی کیا ہے کل اک اک بوند کو ترسے گا میخانہ
جو اہلِ ظرف کے ہاتھوں میں پیمانے نہیں آئے

جمودِ زندگی میں بے پئے ہلنا بھی مشکل تھا
جہادِ زندگی میں یاد میخانے نہیں آئے

گلے مجھ کو لگا کر وہ کسی کا ناز سے کہنا
حفیظِ بے وفا ہم تجھ کو اپنانے نہیں آئے

★★

☆
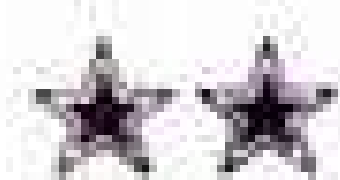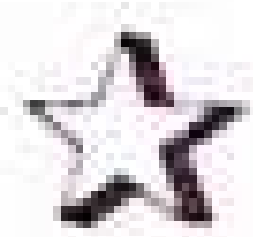
دار و رسن نے کس کو چُنا دیکھتے چلیں!
یہ کون سربُلند ہوا دیکھتے چلیں

آئے گا پھر چمن پہ تصرف کا وقت بھی
پہلے قفس کی آب و ہوا دیکھتے چلیں

اوروں کی لغزشوں ہی پہ رکھیں نہ بس نگاہ
اپنی طرف بھی راہ نُما دیکھتے چلیں

پروانوں کا تو حشر جو ہونا تھا ہو چکا
گزری ہے رات شمع پہ کیا دیکھتے چلیں

جاتے تھے ہم تو پھیر کے منہ جلوہ گاہ سے
لیکن دل و نظر نے کہا دیکھتے چلیں

تہذیبِ نو کے عہد میں انسانیت کے ساتھ
انساں نے کیا سلوک کِیا دیکھتے چلیں

اس انجمن میں عشق کہاں ہے ہوس کہاں
کس کس کو کیا مقام ملا دیکھتے چلیں

ہاں اک نظر حفیظؔ پہ عبرت کے واسطے
کیا رہ گئی ہے قدرِ وفا دیکھتے چلیں

☆☆

☆

نہیں ہوتیں کبھی ساحل کے ارمانوں سے وابستہ
ہماری کشتیاں رہتی ہیں طوفانوں سے وابستہ

کہیں مسلی ہوئی کلیاں کہیں روندے ہوئے غنچے
بہت سی داستانیں ہیں شبستانوں سے وابستہ

ہمارا ہی جگر ہے یہ، ہمارا ہی کلیجہ ہے
ہم اپنے زخم رکھتے ہیں نمکدانوں سے وابستہ

نہ لے چل خانقاہوں کی طرف شیخِ حرم مجھ کو
مجاہد کا تو مستقبل ہے میدانوں سے وابستہ

ابھی یہ چلتے چلتے دیکھ لیتے ہیں خراشوں کو
ابھی کچھ اور زنجیریں ہیں دیوانوں سے وابستہ

میں یوں رہزن کے بدلے پاسباں پر وار کرتا ہوں
مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے وابستہ

ہماری بے قراری کو نہ چھیڑو مطمئن لوگو!
کہ تقدیر سکوں ہے ہم پریشانوں سے وابستہ

مورّخ تیری رنگ آمیزیاں تو خوب ہیں لیکن
کہیں تاریخ ہو جائے نہ افسانوں سے وابستہ

محبّت خامشی بھی، چیخ بھی، نغمہ بھی، نعرہ بھی
یہ اک مضمون ہے کتنے ہی عنوانوں سے وابستہ

حفیظؔ میرٹھی کو کون پہچانے کہ بیچارہ
نہ ایوانوں سے وابستہ نہ دربانوں سے وابستہ

★★

☆
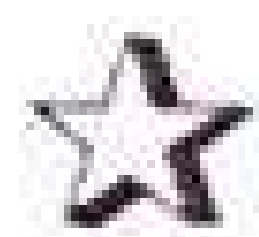
ان رہبرانِ قوم کی کیا پیروی کریں
جو رہبری کے نام پہ سوداگری کریں

نادان تو نہیں ہیں کہ یوں خودکشی کریں
ہم اور تیرے درد سے پہلو تہی کریں

ہر سمت ظلمتوں کے پرستار ہیں یہاں
شمعیں کدھر جلائیں کدھر روشنی کریں

دولت نے ہم سے ہاتھ ملایا تو ہے مگر
اس دشمنِ قرار سے کیا دوستی کریں

اے جبر آج فیصلہ کر کے اٹھیں گے ہم
جھک جائیں تیرے سامنے یا سرکشی کریں

مردانِ حق پرست کو ہر کربلا قبول
پیچیدہ مسئلہ ہو تو کچھ غور بھی کریں

خودداریوں کی جان بچانے کے واسطے
جی میں یہ آرہی ہے کہیں خودکشی کریں

مانا کہ غم زدہ ہیں مگر بزم میں حفیظؔ
بالکل ہی چپ نہ سادھ لیں کچھ بات بھی کریں

★★

☆
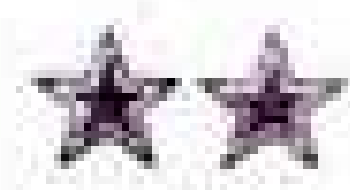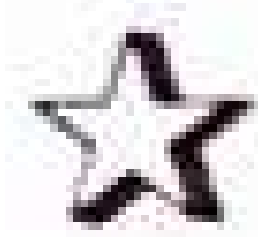
کوئی بھی پیش نہیں آتا مہرباں کی طرح
جہاں میں ہوں کسی ناخواندہ میہماں کی طرح

یہ بے نیاز سہارے نہ کام آئیں گے
ہمیں اٹھائے کوئی نازِ دوستاں کی طرح

متاعِ آخرِ شب ہیں بچے کھچے تارے
بساطِ چرخ پڑی ہے لٹی دکاں کی طرح

یہ کس بہار بداماں چمن میں آگ لگی!
مہک رہا ہے دھواں زلفِ دلبراں کی طرح

میں اپنے دور کی روداد بر بریت بھی
سنا رہا ہوں محبت کی داستاں کی طرح

ہمارا جذبہ تعمیر دیکھ لے دنیا
سجا رہے ہیں قفس کو بھی آشیاں کی طرح

کچھ اس ادا سے چمن کا شعور جاگا ہے
کلی کلی نظر آتی ہے باغباں کی طرح

سفر کے نام سے چیں بر جبیں رہے جو لوگ
وہ منزلوں پہ ملے میرِ کارواں کی طرح

کھنڈر میں ہو گیا تبدیل شاندار محل
حفیظؔ آپ کی مٹتی ہوئی زباں کی طرح

★★

☆
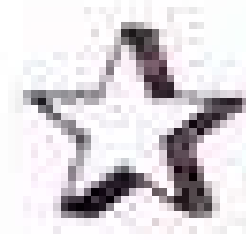
وہ بھی آزردہ نہ ہوں دل کی خلش بھی کم کریں
یعنی شکوہ تو کریں ان سے مگر مبہم کریں

عشق کی دنیا سے پیدا حسن کا عالم کریں
آہ کو نکہت بنائیں، اشک کو شبنم کریں

چاندنی کے ساتھ ہی تارے بھی رخصت ہو چلے
اس مناسب وقت پیمانِ وفا محکم کریں

پھر کریں تعریف اُن کے منہ پر انکے حسن کی
'بے وفا' کہہ کر یکایک پھر اُنھیں برہم کریں

چل دیا جانے کدھر ہستی کی سرحد سے حفیظؔ
ایسے آوارہ کا ناحق آپ اتنا غم کریں

★★

☆
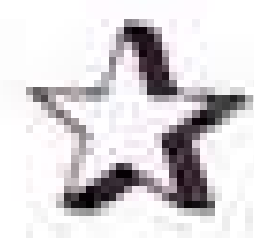
کیا جانے کیا سبب ہے کہ جی چاہتا ہے آج
روئے ہی جائیں سامنے تم کو بٹھا کے ہم

اب انتہائے ضبط نے دل میں لگا دی آگ
بیٹھے تھے آنسوؤں کی بغاوت دبا کے ہم

کیسا خیال، کس کی محبت، کہاں کا عشق!
یونہی جھجک گئے تھے ترے پاس آ کے ہم

سچ ہے کبھی کی رات بڑی اور کبھی کے دن
جاتے ہیں تیرے ہاتھ سے دامن چھڑا کے ہم

★★

☆
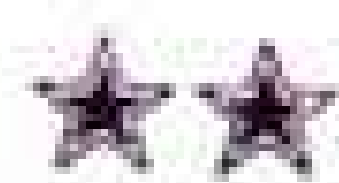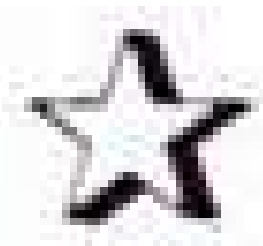
یہ فلسفہ بھی ہے اور دل کا فیصلہ بھی ہے
سپردگی ہی نہیں عشق میں انا بھی ہے

اگرچہ درد کی شدّت سے چیختا بھی ہے
تڑپنے والے میں جینے کا حوصلہ بھی ہے

نظر سے عہدِ وفا لے لیا ہے جلوؤں نے
ادھر حجاب سے ان کا معاہدہ بھی ہے

کچھ اہتمام خصوصی کی فکر کر ساقی
کہ آج رندوں کے ساتھ ایک پارسا بھی ہے

زبانِ خَلق کا یوں تو کچھ اعتبار نہیں
زبانِ خَلق ہی نقارۂ خدا بھی ہے

سمجھ کے سوچ کے ہم کو خوش آمدید کہو
ہمارے ساتھ مسائل کا قافلہ بھی ہے

فقط زبان سے اقرار ہی نہیں کافی
سوال عہدِ وفا کے نباہ کا بھی ہے

نہ کارزارِ جہاں میں نہ خانقاہوں میں
جنابِ شیخ کہیں آپ کا پتہ بھی ہے

نیاز و ناز کی لذّت حفیظؔ سے پوچھو
خدا شناس بھی ہے وہ خود آشنا بھی ہے

★★

☆
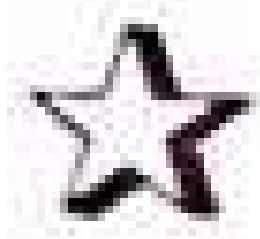
کھینچ کر بازار میں شہرت کے لے آیا مجھے
آہ میرا قدرداں بھی کب سمجھ پایا مجھے

جرم ہے جس پر ترس کھانا وہ دکھیارا ہوں میں
کیوں بلاتا ہے کسی دیوار کا سایہ مجھے

میں نے کس در پر عقیدت سے جبیں سائی نہ کی
کون سے در نے حقارت سے نہ ٹھکرایا مجھے

جراَتِ عرضِ تمنّا پر مسرّت بھی ہوئی
ساتھ ہی خودداریوں پر رحم بھی آیا مجھے

یہ بھی کیا اے غمگسارو مجھ سے چھن جانے کو ہے
زندگی پر آج اتنا پیار کیوں آیا مجھے

چارہ سازی کی تو فرصت کس کو ہے لیکن حفیظؔ
دوستوں کا طرزِ دلجوئی پسند آیا مجھے

★★

☆
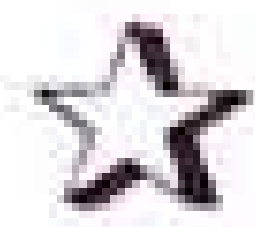
بڑے ادب سے غرورِ ستمگراں بولا
جب انقلاب کے لہجے میں بے زباں بولا

'تکو گے یونہی ہواؤں کا منھ بھلا کب تک؟'
یہ ناخداؤں سے اک روز بادباں بولا

ابھی سے ہوش اڑے مصلحت پرستوں کے
ابھی میں بزم میں آیا ابھی کہاں بولا

چمن میں سب کی زباں پر تھی میری مظلومی
مرے خلاف جو بولا تو باغباں بولا

'یہی بہت ہے کہ زندہ تو ہو میاں صاحب!'
زمانہ سُن کے مرے غم کی داستاں بولا

تُلے ہیں قتل پہ پھولوں میں تولنے والے
اک ایسا بول میں جھوٹوں کے درمیاں بولا

حصارِ جبر میں زندہ بدن جلائے گئے
کسی نے دم نہیں مارا مگر دھواں بولا

اثر ہوا تو یہ تقریر کا کمال نہیں
مرا خلوص مخاطب تھا میں کہاں بولا

'کہا نہ تھا کہ نوازیں گے ہم حفیظؔ تجھے'
اُڑا کے وہ مرے دامن کی دھجیاں بولا

★★

☆
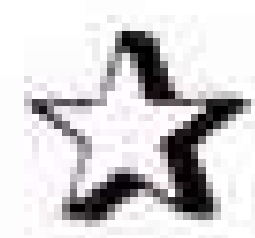
ایسی آسانی سے قابو میں کہاں آتی ہے آگ
جب بھڑکتی ہے تو بھڑکے ہی چلی جاتی ہے آگ

خاک سرگرمی دکھائیں بے حسی کے شہر میں
برف کے ماحول میں رہ کر ٹھٹھر جاتی ہے آگ

پاسباں آنکھیں ملے، انگڑائی لے، آواز دے
اتنے عرصے میں تو اپنا کام کر جاتی ہے آگ

آنسوؤں سے کیا بجھے گی دوستو دل کی لگی
اور بھی پانی کے چھینٹوں سے بھڑک جاتی ہے آگ

حل ہوئے ہیں مسئلے شبنم مزاجی سے مگر
گتھیاں ایسی بھی ہیں کچھ جن کو سلجھاتی ہے آگ

یہ بھی اک حساس دل رکھتی ہے پہلو میں ضرور
گدگداتا ہے کوئی جھونکا تو بل کھاتی ہے آگ

جب کوئی آغوش کھلتا ہی نہیں اس کے لئے
ڈھانپ کر منھ راکھ کے بستر پہ سو جاتی ہے آگ

امن ہی کے دیوتاؤں کے اشاروں پر حفیظؔ
جنگ کی دیوی کھلے شہروں پہ برساتی ہے آگ

★★

☆
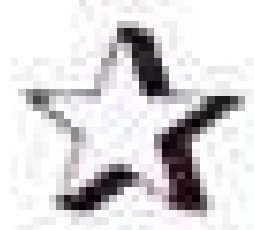
مہرباں وہ لبِ جو آج ہوا پانی پر
چھیڑ کر پاؤں سے احسان کیا پانی پر

نقش کا تو کبھی جادو نہ چلا پانی پر
رنگ کائی کا مگر جم کے رہا پانی پر

سنگ دل لوگ تھے پہرہ تھا کڑا پانی پر
میں نے آنسو ہی پیے' بس نہ چلا پانی پر

موجہ مے سے تراشا ہوا اندازِ خرام
آپ چلتے ہیں کہ چلتی ہے صبا پانی پر

ہو گیا شیخ کی مہمان نوازی کا شکار
اکتفا رِند کو کرنا ہی پڑا پانی پر

لیجئے مل گئی بیچارے غریبوں کو دوا
پڑھ کے اک شخص نے کچھ پھونک دیا پانی پر

خون اس دورِ گرانی میں بہت سستا ہے
رات پھر گاؤں میں اک قتل ہوا پانی پر

کتنے پانی میں ہوں میں جان گیا یہ پانی
اک جھجک نے ہی بھرم کھول دیا پانی پر

جھیل میں ڈوب گیا جان سے بیزار بدن
تیرتا رہ گیا مٹی کا گھڑا پانی پر

یہ بتا کر کہ گلاسوں کی شرارت تھی حفیظؔ
دھو دیا ہم نے وہ الزام جو تھا پانی پر

★★

☆
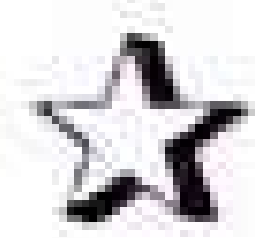
بزمِ تکلّفات سجانے میں رہ گیا
میں زندگی کے ناز اٹھانے میں رہ گیا

تاثیر کے لئے جہاں تحریف کی گئی
اک جھول بس وہیں پہ فسانے میں رہ گیا

سب مجھ پہ مُہرِ جرم لگاتے چلے گئے
میں سب کو اپنے زخم دکھانے میں رہ گیا

خود حادثہ بھی موت پہ اس کی تھا دَم بخود
وہ دوسروں کی جان بچانے میں رہ گیا

اب اہلِ کارواں پہ لگاتا ہے تہمتیں
وہ ہم سفر جو حیلے بہانے میں رہ گیا

میدانِ کارزار میں آئے وہ قوم کیا
جس کا جوان آئنہ خانے میں رہ گیا

وہ وقت کا جہاز تھا کرتا لحاظ کیا
میں دوستوں سے ہاتھ ملانے میں رہ گیا

سنتا نہیں ہے مفت جہاں بات بھی کوئی
میں خالی ہاتھ ایسے زمانے میں رہ گیا

بازارِ زندگی سے قضا لے گئی مجھے
یہ دور میرے دام لگانے میں رہ گیا

یہ بھی ہے ایک کارِ نمایاں حفیظؔ کا
کیا سادہ لوح کیسے زمانے میں رہ گیا

★★

☆
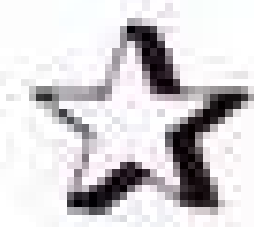
پونچھے گا نہ کوئی بھی دلِ زار کے آنسو
خود خاک میں مل جائیں گے تھک ہار کے آنسو

منہ پھیر لیں ہمدرد تو احسان کریں گے
غم اور بڑھا دیتے ہیں غمخوار کے آنسو

آنکھوں کی قسم ہم سے تو دیکھے نہیں جاتے
نادار کے آنسو ہوں کہ زردار کے آنسو

تنہائی میں ساقی کے قدم چوم رہے ہیں
میخانے سے روٹھے ہوئے میخوار کے آنسو

ہنس کر وہ مرے گریۂ پیہم پہ یہ بولے
کیا دیکھیے دیکھے ہوئے سو بار کے آنسو

ہر سنگ ہے غم کے لئے اک شیشہ نازک
اک ٹھیس میں آجاتے ہیں پندار کے آنسو

تخلیق میں آتے نہیں شہکار کے انداز
جب تک نہ سنواریں اسے فنکار کے آنسو

ہم نے بھی جگر تھام کے دیکھے ہیں حفیظؔ آج
رخسارِ غزل پر ترے اشعار کے آنسو

★★

☆
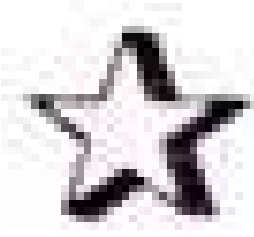
قہر آلودہ تھے ماحول کے تیور کتنے
معرکے پھر بھی محبّت نے کیے سر کتنے

وہ جو دھندلائے ہوئے نقش تھے امیدوں کے
ہو گئے ایک تبسم سے اجاگر کتنے

دلِ انساں پہ حوادث کی یہ چوٹیں توبہ
پھول کے سینے پہ توڑے گئے پتھر کتنے

صبر تو آ گیا آرام نہ آیا نہ سہی
سو گئے درد کو پہلو میں دبا کر کتنے

اپنی ہستی پہ نہ اترائے کوئی کوہِ غرور
وقت نے پھینک دیے ایسے اٹھا کر کتنے

مڑ کے دیکھا تو نظر آئے بہت چیں بہ جبیں
یہی احباب ملے تھے ابھی ہنس کر کتنے

مجھ کو طوفان سے لڑنے میں مزا آتا ہے
ورنہ بہہ جاتے ہیں سیلاب کے رخ پر کتنے

مدتوں پھول سمجھتی رہی ان کو دنیا
ہم نے تو زخم بھی رکھّے ہیں سجا کر کتنے

آپ کا دم بھی غنیمت نظر آتا ہے حفیظؔ
رہ گئے ہیں بھلا اب ایسے قلندر کتنے

★★

☆
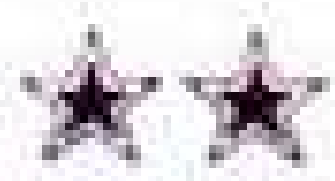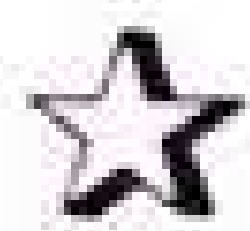
لہو سے اپنے زمیں لالہ زار دیکھتے تھے
بہار دیکھنے والے بہار دیکھتے تھے

سرور ایک جھلک کا تمام عمر رہا
ہوس پرست تھے جو بار بار دیکھتے تھے

کبھی کبھی ہمیں دنیا حسین لگتی تھی
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پیار دیکھتے تھے

چلا وہ دورِ ستم گھر میں چھپ کے بیٹھ گئے
جو ہر صلیب کو مردانہ وار دیکھتے تھے

کبھی جہادِ مسلسل تھی زندگی اپنی
سکوں اِسی میں، اِسی میں قرار دیکھتے تھے

ملے تھے ملنے کو لیکن جدا جدا ہی رہے
سبب یہ ہے کہ سب اپنا وقار دیکھتے تھے

نہ دیجئے انہیں الزام قتل کا وہ تو
بس اک ذرا نئے خنجر کی دھار دیکھتے تھے

صبا نے لمس کا مرہم جو زخمِ گل پہ رکھا
تری طرف ترے سینہ فگار دیکھتے تھے

اگرچہ بسترِ آسودگی پہ تھے پھر بھی
وطن کے خواب غریب الدیار دیکھتے تھے

کسی کو درسِ قناعت حفیظؔ کیا دیتے
خود اپنے گرد ہوس کا حصار دیکھتے تھے

★★

☆
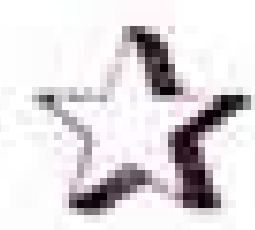
پھول تو رہ گئے کیسہ زر لئے
اور شبنم نے موتی لٹا بھی دئے

ان کے جانے کا منظر تماشہ نہیں
دور تک دیکھئے، دیر تک سوچئے

ساز و آواز کے دورِ پُرشور میں
عشق کی بے نوائی کو کیا کیجئے

ہم تو دیوانے ٹھہرے ہمیں کیا خبر
جانے کیوں ہنس پڑے جانے کیوں رو دئے

درد پر تبصرہ تو بہت ہو چکا
درد کو آپ محسوس بھی کیجئے

جام ساقی نے جب بے رخی سے دیا
میکدے سے نکل آئے ہم بے پئے

شیخ صاحب تمھاری بھی اچھی کٹی
خوب سجدے کئے، خوب دھوکے دئے

انجمن کیف و مستی میں ڈوبی رہی
شمع گھلتی رہی انجمن کے لئے

اے حفیظؔ اس نے کس سادگی سے کہا
آپ کیا عرض کرتے ہیں فرمائیے

⋆⋆

☆
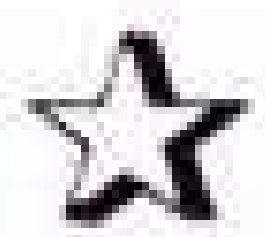
سمٹے بیٹھے ہو کیوں بزدلوں کی طرح
آؤ میدان میں غازیوں کی طرح

کون رکھتا ہمیں موتیوں کی طرح
مل گئے خاک میں آنسوؤں کی طرح

روشنی کب تھی اتنی مرے شہر میں
جل رہے ہیں مکاں مشعلوں کی طرح

زندگی اب ہماری خطا بخش دے
دوست ملنے لگے محسنوں کی طرح

کیسے اللہ والے ہیں یہ اے خدا
گفتگو، مشورے، سازشوں کی طرح

میری باتوں پہ ہنستی ہے دنیا ابھی
میں سنا جاؤں گا فیصلوں کی طرح

تم بھی دربار میں حاضری دو حفیظؔ
پھر رہے ہو کہاں مفلسوں کی طرح

★★

☆
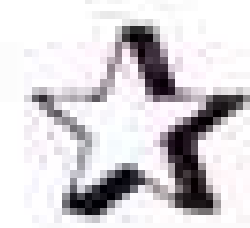
آدمی بے چین ہے، بد حال ہے، رنجیدہ ہے
اے مرے احساس تو آخر کہاں خوابیدہ ہے

شکر ہے اس پر کسی کی بھی نظر جاتی نہیں
مسکراہٹ میں ہماری کرب جو پوشیدہ ہے

دو گھڑی مل بیٹھنے سے سب پتہ چل جائے گا
جو بظاہر خوش ہے وہ بھی اصل میں رنجیدہ ہے

اُس طرف مت دیکھئے، مت دیکھئے، مت دیکھئے
وہ نظر بھی کام کر جائیگی جو دزدیدہ ہے

جتنا سلجھاؤ گے یہ اتنا الجھتا جائے گا
مسئلہ تقدیر کا یارو بہت پیچیدہ ہے

عقل بھی نا معتبر ہے، عشق بھی نا معتبر
اس زمانہ میں نہ یہ مخلص نہ وہ سنجیدہ ہے

یوں تو ہر آنسو ہے میری آنکھ کا تارا حفیظؔ
جو غمِ جاناں نے بخشا آبروئے دیدہ ہے

★★

☆
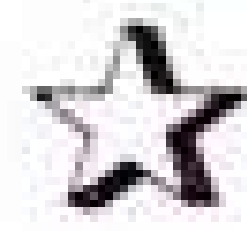
خلوصِ دل کی جھلک جب سخن میں آئی ہے
تو زندگی سی نظر انجمن میں آئی ہے

ہمیں تو بادِ صبا کا بھی اعتبار نہیں
خزاں سے ہاتھ ملا کر چمن میں آئی ہے

تمھاری یاد نے روشن کیے ہیں دل میں چراغ
تمھارے ذکر سے خوشبو دہن میں آئی ہے

کرم ہے یہ بھی مسافر نواز لوگوں کا
ہماری لاش ہمارے وطن میں آئی ہے

یہ کیا سلوک محبّت سے آدمی نے کیا
لباسِ گل میں گئی تھی کفن میں آئی ہے

حفیظؔ تم ہی ذرا زندگی سے بات کرو
جو دل کا درد لئے اہلِ فن میں آئی ہے

★★

☆
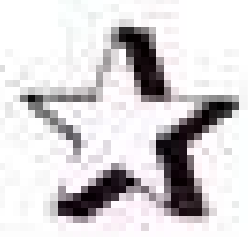
ہم مخلصوں کے ان سے جو دشمن بہت ملے
یارانِ باوفا سے وہ بدظن بہت ملے

زد میں نہ ہو جو برق کی ایسا کوئی نہ تھا
ملنے کو یوں چمن میں نشیمن بہت ملے

یہ اور بات ہے کہ اندھیرا دلوں میں تھا
اُس بزم میں چراغ تو روشن بہت ملے

نزدیک آتے آتے برہمن ٹھٹک گیا
جب شیخ کے قریب ہریجن بہت ملے

بے فکر و مطمئن تھے جو رکھتے نہ تھے دماغ
عقدہ کشا لیے ہوئے الجھن بہت ملے

پہنچے گا کارواں یہ کہاں ہم سمجھ گئے
رہبر کے اردگرد جو رہزن بہت ملے

انسان آسمانوں کے در کھولنے لگا
امکان جب رسائی کے روشن بہت ملے

گھرا ہوا ہے رنگ اندھیرے کا جب حفیظؔ
امکان روشنی کے بھی روشن بہت ملے

★★

☆

جب سخن فہموں کی دنیا میں کمی ہونے لگی
شاعری رخصت ہوئی خانہ پُری ہونے لگی

میں نے چاہا تھا کہ دشمن کی تباہی پر ہنسوں
طعنہ زن مجھ پر مری شائستگی ہونے لگی

جب کسی گلفام کا دامن الجھ کر رہ گیا
خار کو محسوس اپنی برتری ہونے لگی

رفتہ رفتہ اور بھی پابندیاں ہٹ جائیں گی
محتسب کے شہر میں شیشہ گری ہونے لگی

کس قدر تاریک تھیں راہیں مگر جب چل پڑے
خاک کے ذروں سے پیدا روشنی ہونے لگی

ہم تو اٹھ آئے حفیظؔ احباب کو کر کے سلام
انجمن میں بحث جب بیکار کی ہونے لگی

☆☆

☆

بادِصبا! یہ ظلم خدارا نہ کیجیو
اُس بے وفا سے ذکر ہمارا نہ کیجیو

غم کی کمی نہیں ہے جہانِ خراب میں
اے دل ترس ترس کے گزارا نہ کیجیو

بدتر ہے موت سے بھی غلامی کی زندگی
مر جائیو مگر یہ گوارا نہ کیجیو

ہم اٹھ کے چل دیے تو پلٹ کر نہ آئیں گے
اے بزم! انتظار ہمارا نہ کیجیو

اے صاحبِ عروج تو بامِ عروج سے
سورج کے ڈوبنے کا نظارا نہ کیجیو

ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمیں پوجنے لگیں
اتنا بھی احترام ہمارا نہ کیجیو

ساحل اگر نصیب بھی ہو جائے اے حفیظؔ
طوفاں سے بھول کر بھی کنارا نہ کیجیو

★★

☆
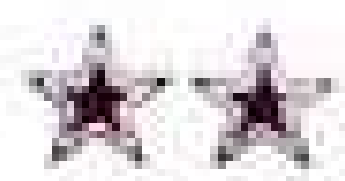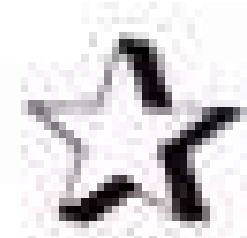
حاصل ہیں رہزنوں کی جو خدمات ان دنوں
رہبر بنا ہے قبلہ حاجات ان دنوں

الجھے ہیں بیش و کم میں خیالات ان دنوں
سب ہیں اسیرِ زلفِ مفادات ان دنوں

دامن نصیب ہے نہ گریباں نصیب ہے
کیسے کریں جنوں کی مدارات ان دنوں

اُترو نہ آسماں سے فرشتو ! وہیں رہو
اچھے نہیں زمین کے حالات ان دنوں

اہلِ ہنر کی قدر بھی ان میں سے ایک ہے
ناپید ہو گئیں جو روایات ان دنوں

جس بات پر کٹی ہیں زبانیں ہزار بار
کہنے اٹھے ہیں ہم بھی وہی بات ان دنوں

اللہ تیرا شکر کہاں تک ادا کروں
مجھ پر برس رہی ہیں عنایات ان دنوں

حل ہو تو کس طرح ہو کوئی مسئلہ حفیظؔ
چھائے ہوئے ہیں عقل پہ جذبات ان دنوں

★★

☆
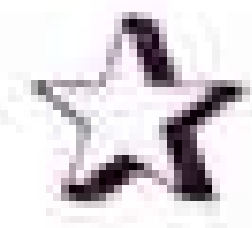
شاعروں کے، نہ کسی اہلِ قلم کے ہاتھوں
آپ بدنام ہوئے اپنے ستم کے ہاتھوں

اس لیے راہزنوں سے میں بہت نادم ہوں
ان کو زحمت جو ہوئی میرے بھرم کے ہاتھوں

ہم تو سمجھے تھے کہ دنیا کو رُلا ڈالیں گے
جگ ہنسائی ہوئی رودادِ الم کے ہاتھوں

اپنے کشکول سے سر پھوڑ لیں ناداں اپنا
وہ جو برباد ہوئے دستِ کرم کے ہاتھوں

اتنے آسودہ کہاں تھے بھلا اب سے پہلے
بن گئے ہم ترے فیضانِ ستم کے ہاتھوں

تب خیال آیا کہ میں جھوٹ کے بازار میں ہوں
زندگی بک گئی جب قول و قسم کے ہاتھوں

ہر ستایا ہوا ملتا ہے لپٹ کر مجھ سے
شخصیت میں یہ کشش آئی ہے غم کے ہاتھوں

جشنِ گریہ کا یہ آغازِ حسیں تو دیکھو
شمعیں پلکوں پہ جلیں شامِ الم کے ہاتھوں

سر بکف ہم جو بڑھے دین کی نصرت کو حفیظ
کفر کا فتویٰ لگا شیخِ حرم کے ہاتھوں

★★

☆
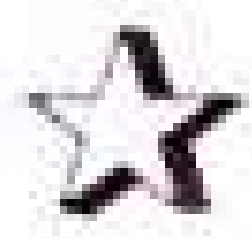
ساقیا پوچھ نہ ہم سے کہ شکایت کیا ہے
تو ہی خود دیکھ لے میخانے کی حالت کیا ہے

فخر سے پڑھتے ہیں سب نسل ونسب کے شجرے
کس کو سمجھائیں کہ مفہومِ شرافت کیا ہے

رنگ آنکھوں کے لئے' بو ہے دماغوں کے لئے
پھول کو ہاتھ لگانے کی ضرورت کیا ہے

اپنے دامن کے لئے خار چُنے خود ہم نے
اب یہ چبھتے ہیں تو پھر ان سے شکایت کیا ہے

حورِ جنت کی تمنا نہیں کرتا اب شیخ
جب سے دیکھا ہے کہ آغوشِ حکومت کیا ہے

لا مری سمت بڑھا جامِ محبّت ساقی
میں نہ پوچھوں گا کہ انجامِ محبّت کیا ہے

ہائے کیا وقت پڑا ہے کہ مری مجبوری
مجھ سے یہ پوچھ رہی ہے تری قیمت کیا ہے

حق کی راہوں میں کہاں راحت و آرام حفیظؔ
ہم اگر ٹھوکریں کھاتے ہیں تو حیرت کیا ہے

★★

☆
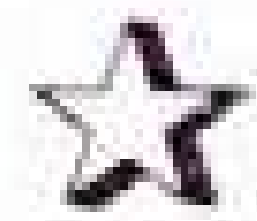
کل رات جس نے میکدہ سر پر اٹھا لیا
میرا جنونِ شوق تھا ساقی! وہ میں نہ تھا

ٹھکرایئے کسے؟ کسے اپنا بنایئے!
نفرت ہی دیرپا نہ محبّت ہی دیرپا

وہ شرم ہے کہ گھر سے نکلنا محال ہے
سنتا ہوں میرے شہر میں بیگانہ لُٹ گیا

یہ کیا مقام ہے کہ ہمارے کلام پر
تنقید کی گئی، نہ کوئی تبصرہ ہوا

تحسین و آفریں مرے دشمن کے وار پر
اللہ! میرے چاہنے والوں کو کیا ہوا

یہ واقعہ ہے وہ رگِ جاں سے قریب تھا
لیکن میں ساری عمر اسے چھو نہیں سکا

تر ہے گلابِ اشک سے ہر آستیں حفیظؔ
شاید مری زبان پہ ذکرِ جمیل تھا

★★

☆
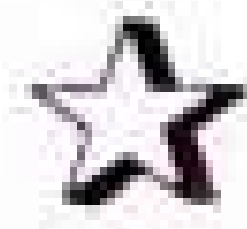
میں غم غلط نہ کروں گا شراب سے ساقی
خطا معاف مجھے بے حسی پسند نہیں

مجھے نگاہِ ترحُّم سے دیکھنے والے
مری خودی کو تو یہ بھیک بھی پسند نہیں

سکوں میں درد کے پہلو تلاش کرتے ہیں
ہم ایسے لوگ جو آسودگی پسند نہیں

نہ ٹوٹ جائے کہیں خوش گمانیوں کا طلسم
کسی سے اس لئے وابستگی پسند نہیں

مرے حواس، مرا ہوش لُوٹنے والے!
تجھے بھی کیا مری دیوانگی پسند نہیں

ہر اک زباں پہ ہے پیغامِ آشتی کا حفیظؔ
کوئی بھی دل سے مگر آشتی پسند نہیں

★★

☆
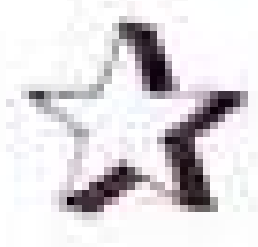
ستم کی تیغ یہ کہتی ہے سر نہ اونچا کر
پکارتی ہے بُلندی کہ زندگی ہے اِدھر

چمن میں ہم نہ رہیں گے ترے پلٹنے تک
ٹھہر ٹھہر ذرا جاتی ہوئی بہار ٹھہر

مری جبیں پہ اُبھرنے لگے نقوشِ غرور
مرے سنوارنے والے مجھے تباہ نہ کر

کوئی فریب نہ کھائے سفید پوشی سے
نہ جانے کتنے ستارے نگل گئی ہے سحر

تو جوہری ہے تو زیبا نہیں تجھے یہ گریز
مجھے پرکھ مری شہرت کا انتظار نہ کر

حفیظؔ کتنے ہی چہرے اداس ہونے لگے
ہمارے فن کو سراہیں بہت نہ اہلِ نظر

★★

☆
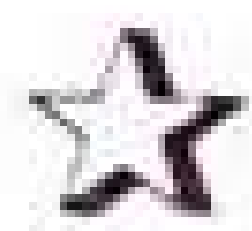
ہمارا خون بہا ہے جہاں تہاں لوگو
مگر یہ خون نہ جائے گا رائگاں لوگو

ہمیں بنیں گے تمھارے بھی ترجماں لوگو
ذرا تم اشک تو چھلکاؤ بے زباں لوگو

خدا کا شکر کہ محفل میں ذکرِ دار چھڑا
ہمیں تو آنے لگی تھیں جماہیاں لوگو

نکالنے ہیں تمہیں خود ہی پاؤں کے کانٹے
پلٹ کے تم کو نہ دیکھے گا کارواں لوگو

لگی تھی ٹھیس ہی کچھ تیز و تند لہجوں کی
بکھر کے رہ گئیں شیشہ مزاجیاں لوگو

بغیر معجزہ یوں پھوٹتے نہیں چشمے
کوئی رگڑتا رہے لاکھ ایڑیاں لوگو

جو چاہتے ہو کہ تاریخ تابناک بنے
ملا دو خاک میں اپنی جوانیاں لوگو

ستم کے بعد کرم کے پیام آئیں گے
مقام یہ بڑا نازک ہے سخت جاں لوگو

وہیں وہیں نظر آیا ہے سربُلند حفیظؔ
پڑی ہے سر کی ضرورت جہاں جہاں لوگو

★★

☆
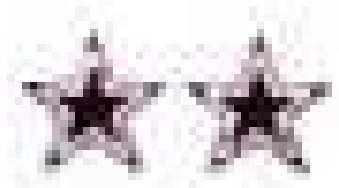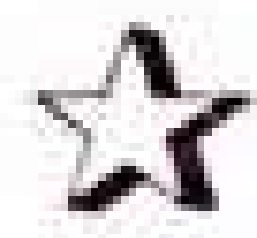
اِس سے پہلے کس طرح اِس کو کسی قابل کہیں
درد کو درماں بنا ڈالے تو دل کو دل کہیں

ظلم ہے یہ بھی سراسر یہ بھی اک توہین ہے
جانِ محفل کو اگر ہم رونقِ محفل کہیں

ایک ٹھوکر کی حقیقت کچھ نہیں یوں تو مگر
کھول دے آنکھیں تو ساری عمر کا حاصل کہیں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں دنیا کے بھرے بازار میں
ایک معمولی سی شے جس کو سکونِ دل کہیں

ایک تو کشتی ڈبو دی ناخدا نے اور پھر
اِس پہ اُترا ہے کہ ہم گرداب کو ساحل کہیں

پھر نہ آئیں جو کسی کی بے کسی پر اے حفیظؔ
اس کو کیسے آنکھ کہہ دیں اس کو کیونکر دل کہیں

★★

☆
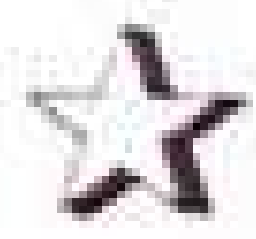
جرم کیا سنگین ایسا ہو گیا ان سے کوئی
پتھروں سے توڑتا پھرتا ہے آئینے کوئی

چین آتا ہے نکل کر ان کی محفل سے کوئی
کھٹکھٹائے گا نہ جانے کتنے دروازے کوئی

انجمن میں آ کے سب سے گرم جوشی سے ملا
ایک نووارد جسے جانے نہ پہچانے کوئی

عقل والے تو سمجھ لیتے ہیں دل والوں کی بات
عقل کے ماروں کو لیکن کیسے سمجھائے کوئی

آج خود اپنی غرض سے اُس کے گھر جاتا ہوں میں
کل بلاتا رہ گیا مجھ کو محبت سے کوئی

کتنے چہروں کی بشاشت کا ہے اس پر انحصار
میری مصنوعی خوشی کی قدر کیا جانے کوئی

یونہی مت کر لیجیے احسان کے تحفے قبول
جانے کس احسان کے بدلے میں کیا مانگے کوئی

جو کسی فنکار کو خاطر میں لاتے ہی نہیں
ایسے فنکاروں سے فن کی داد کیا پائے کوئی

جان تک دے دی وفا کی راہ میں ہم نے حفیظؔ
کیا کریں پھر بھی اگر ہم کو نہ پہچانے کوئی

★★

☆
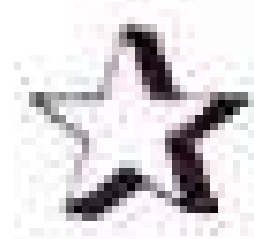
حوصلوں کو دھمکیاں دیتی ہوئی موجیں ملیں
پھر وہی رہزن نظر آئے وہی راہیں ملیں

اور کیا ملتا ہمیں اس دور کے احباب سے
دل شکن فقرے ملے، طعنے ملے، چوٹیں ملیں

آگیا جب سامنے تقدیر کا لکھا ہوا
سب جلا ڈالیں تری جتنی بھی تحریریں ملیں

سب ہماری خیر خواہی کے علمبردار تھے
سب کے دامن پر ہمارے خون کی چھینٹیں ملیں

پستی کردار کا رونا کہاں تک روئیے
ہر طرف بکھری ہوئی کردار کی لاشیں ملیں

اب خوشی کو ڈھونڈنے آخر کہاں جائیں حفیظؔ
قہقہوں کے شہر میں پہنچے تو فریادیں ملیں

★★

☆
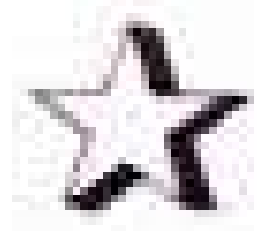
اب سوئے شہر جائے کہ صحرا کا رخ کرے
ہم نے تو دل کو چھوڑ دیا اس کے حال پر

ان کی جبینِ ناز پہ جس سے شکن پڑے
پابندیاں ہیں آج ہر ایسے خیال پر

کیوں بار بار دیکھتے ہیں آپ آئنہ
کیا شک ہے آپ کو مرے ذوقِ جمال پر

پہنچا ہے جن کے ہاتھوں سے اس حال کو حفیظ
آنسو بہا رہے ہیں وہی اس کے حال پر

★★

☆

اسیروں کے لیے سوغات ہو گی
ہمیں کانٹے ہی بھجوا دو چمن سے

وطن سے دور یوں لگتا ہے جیسے
کوئی آواز دیتا ہو وطن سے

زمانہ آپ ہو جائے گا واقف
ہماری شخصیت سے، فکر و فن سے

حفیظؔ اس میں کسی کا کیا اجارہ
ہوا گر شیخ بیعت برہمن سے

★★

☆

جان کر بھی آج ساقی نے نہیں جانا ہمیں
وقت آئے گا کہ پہچانے گا میخانہ ہمیں

زندگی بھی ہم نہ لیں گے بے ادب کے ہاتھ سے
قتل بھی منظور ہے اپنا شریفانہ ہمیں

سر ہتھیلی پر لئے آئیں گے ہم اہلِ وفا
جب ضرورت ہو ہماری یاد فرمانا ہمیں

آگ ہم گھر کو لگا کر شہر سے نکلے تو ہیں
یہ بھی ممکن ہے کہ اپنائے نہ ویرانہ ہمیں

کھل اٹھیں گے پھول کی مانند ہم حرماں نصیب
تم صبا کی طرح بس چھو کر گزر جانا ہمیں

طالبِ لطف و کرم ہو جب کوئی اہلِ ہوس
ساقیٔ محفل نظر انداز کر جانا ہمیں

مرثیوں، سہروں، قصیدوں کے تقاضے ہیں حفیظؔ
قدردانوں نے ہمارے خوب پہچانا ہمیں
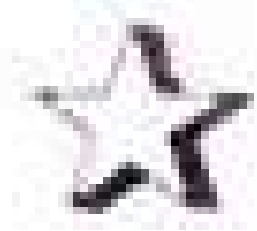
★★

☆

وہ خود بڑا تھا مگر دل بڑا نہ تھا اُس کا
مجھے ملا جو سمندر سراب جیسا تھا

گزار کر تو دکھائے مری طرح کوئی
ترس رہا تھا مگر فیضیاب جیسا تھا

ٹلی ہے سر سے نحوست خدا خدا کر کے
یہ دورِ عیشِ فراواں عذاب جیسا تھا

شریکِ بزم تھا لیکن نظر جھکائے ہوئے
وہ بے حجاب نہ تھا بے حجاب جیسا تھا

عجیب اُس کی ملاقات نے اثر چھوڑا
سحر کا رنگ شبِ ماہتاب جیسا تھا

کسی نے اس سے کبھی حرفِ برہمی نہ سنا
بس اک سکوت ہی اس کا عتاب جیسا تھا

ہمارے آگے نہ کیجے حفیظؔ کی تعریف
ہمیں خبر ہے وہ خانہ خراب جیسا تھا

★★

☆

خطا ہے کس کی؟ اگر بے وقار گزرے ہیں
وہ ہو کے اپنی انا کا شکار گزرے ہیں

ہنسی نہ آئی ہنسانے سے غم کے ماروں کو
طبیعتوں پہ لطیفے بھی بار گزرے ہیں

سحر نے زخم دیے، شام نے نمک چھڑکا
اسی طرح مرے لیل و نہار گزرے ہیں

بزعم خود جو مہذب بھی، حق شناس بھی تھے
صداقتوں پہ اُڑاتے غبار گزرے ہیں

خوشی میں ہو گئے تبدیل سارے رنج و الم
ترے دیار سے جب سوگوار گزرے ہیں

جو شہر شہر اڑاتے تھے ہوش کا پرچم
تری گلی سے وہ دیوانہ وار گزرے ہیں

گھروں سے تا درِ زنداں وہاں سے مقتل تک
ہر امتحاں سے ترے جاں نثار گزرے ہیں

یہ کیا مقام ہے اے اہلِ آگہی جس سے ؟
جنوں کی کھا کے قسم ہوشیار گزرے ہیں

حفیظؔ تُو جنھیں جانِ وفا بتاتا تھا
ترے قریب سے بیگانہ وار گزرے ہیں

★★

☆
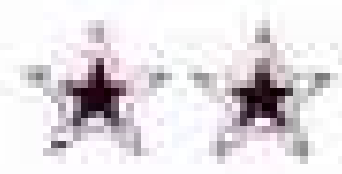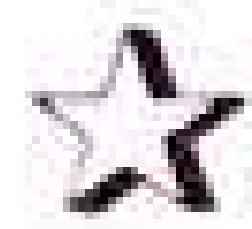
پکارا ہے انھیں شاید قضا نے
پرندے جھیل پر آئے نہانے

نقابوں کے حجابوں کے تکلف
اٹھا ڈالے زمانے کی ہوا نے

ہمارا راستہ جس نے بھی روکا
اسے شاباشیاں دیں رہنما نے

ستم کو وہ کرم ثابت کریں گے
ذہانت ان کو بخشی ہے خدا نے

اٹھی کردار کی جب پاسبانی
ہوئے بدنام باعزت گھرانے

فقط اک عذرِ مجبوری نہ کیجے
بہت ہیں بے وفائی کے بہانے

نہیں لیتے غریبوں کے سلام اب
انھیں چونکا دیا ہے التجا نے

وہ دیکھو آگئے رہبر ہمارے
ہمیں آدابِ مظلومی سکھانے

★★

☆
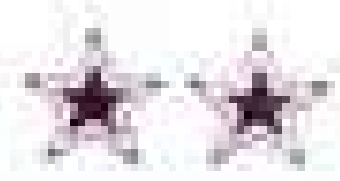
ہنسی ہنسی میں تمھارے جو وار ہوتے ہیں
ستمگری کے وہی شاہکار ہوتے ہیں

ہم ایسے لوگوں سے کیوں دور دور رہتے ہو
ہم ایسے لوگ تو یاروں کے یار ہوتے ہیں

سنائی پھر نہیں دیتی ضمیر کی آواز
دلوں پہ جب سر و ساماں سوار ہوتے ہیں

یہ خانقاہ ہے، بازار تو نہیں لیکن
طرح طرح کے یہاں کاروبار ہوتے ہیں

انھوں نے اہلِ جنوں کو بھی مات کر ڈالا
سنا تھا اہلِ خرد بُردبار ہوتے ہیں

یہی ہُوا ہے کہ اندر سے داغ داغ ملے
وہ، دیکھنے میں جو باغ و بہار ہوتے ہیں

گمان جن کا تصوّر بھی کر نہیں سکتا
یقیں کے پاس وہ مردانِ کار ہوتے ہیں

طلب نہ ہو تو کہیں کچھ نظر نہیں آتا
اگر طلب ہو وسائل ہزار ہوتے ہیں

ذلیل کرتے ہیں خود تبصرہ نگاروں کو
وہ تبصرے جو فقط اشتہار ہوتے ہیں

طلسم ٹوٹ رہا ہے نظامِ باطل کا
اجالے آئے اندھیرے فرار ہوتے ہیں

قیاس کیجئے کتنا بُرا زمانہ ہے
حفیظؔ جی بھی بھلوں میں شمار ہوتے ہیں

★★

☆
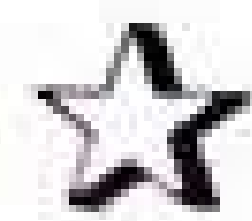
کون کہتا ہے کہ محرومی کا شکوہ نہ کرو
ہاں مگر ساقئ میخانہ کو رسوا نہ کرو

ذکر چھڑ جائے اگر قوم کی بدبختی کا
رہنماؤں کی طرف کوئی اشارا نہ کرو

ذہن سنجیدہ مسائل سے ہٹانے کے لیے
روز یہ شیخ و برہمن کا تماشا نہ کرو

ایک بھی لفظ ہٹانے کی نہیں گنجائش
میرے پیغامِ محبت کا خلاصہ نہ کرو

یہ تعلّق کی خراشیں بھی مزا دیتی ہیں
روٹھ جائے کوئی تم سے تو منایا نہ کرو

اب میں خوابوں سے حقیقت کی طرف جاتا ہوں
میرے ارمانوں کی لاشو مرا پیچھا نہ کرو

آج بھی میں نہیں انسان سے مایوس کہ جب
لوگ کہتے ہیں خدا پر بھی بھروسہ نہ کرو

★★

☆

جنابِ شیخ سے آداب چھوٹے پارسائی کے
مسلمانوں میں چرچے ہیں تری کافر ادائی کے

بڑے لوگوں کو جانے کیوں بُرا محسوس ہوتا ہے
نظر آتے ہیں جب آثار چھوٹوں میں بڑائی کے

ہمارا ظرف تو دیکھو' ہمارا ذوق تو دیکھو
ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں طعنے بے وفائی کے

وہ طوفاں سر جھکا کر آپ ہٹ جاتے ہیں راہوں سے
جو تیور دیکھ لیتے ہیں تمھاری ناخدائی کے

مقامِ شکر ہے یا جائے شکوہ' کیا کہا جائے
توجہ میں تری انداز ہیں بے اعتنائی کے

ہماری زندگی کا کوئی مصرف ہی نہیں شاید
وفاداری کے لائق ہیں نہ قابل بے وفائی کے

جو قتلِ عام کے شاہد تھے، مظلوموں کے حامی تھے
اجارہ دار ہیں دامانِ قاتل کی صفائی کے

حفیظؔ اب وہ مری حق گوئی پر تنقید کرتے ہیں
مرے احباب کو دعوے تھے میری ہمنوائی کے

★★

☆
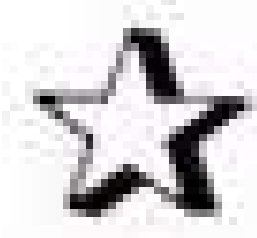
وہ طرزِ سخن میرا ظریفانہ سمجھ کر
سنتے رہے شکوے کو بھی شکوہ نہ سمجھ کر

اپنے جو بہت خاص تھے دشمن سے ملے تھے
ہم ہار گئے جنگ کا نقشہ نہ سمجھ کر

ہلکا سا یہ اک فرق دلوں میں جو پڑا ہے
پچھتاؤ گے اِس زخم کو گہرا نہ سمجھ کر

گھر ہی میں لئے بیٹھے رہے اپنا ہنر ہم
اس جنس کو بازار کا سودا نہ سمجھ کر

یہ اپنی نئی نسل حفیظؔ آپ کی باتیں
سُن لیتی ہے ارشادِ بُزرگانہ سمجھ کر

★★

☆
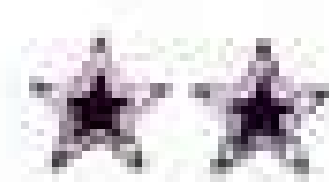
بے سہاروں کا انتظام کرو
یعنی اک اور قتلِ عام کرو

خیر خواہوں کا مشورہ یہ ہے
ٹھوکریں کھاؤ اور سلام کرو

دب کے رہنا ہمیں نہیں منظور
ظالمو جاؤ اپنا کام کرو

سر پھروں میں ابھی حرارت ہے
ان جیالوں کا احترام کرو

میزبانوں میں ہو جہاں ان بن
ایسی بستی میں مت قیام کرو

آپ چھٹ جائیں گے ہوس والے
تم ذرا بے رُخی کو عام کرو

ڈھونڈتے ہو گرے پڑوں کو کیوں
اُڑنے والوں کو زیرِ دام کرو

دینے والا بڑائی بھی دے گا
تم سمائی کا اہتمام کرو

بددعا دے کے چل دیا وہ فقیر
کہہ دیا تھا کہ کوئی کام کرو

یہ ہنر بھی بڑا ضروری ہے
کتنا جھک کر کسے سلام کرو

سانپ آپس میں کہہ رہے ہیں حفیظؔ
آستینوں کا انتظام کرو

★★

☆

جانے کیا شے ہے وہ نظر بھی
وجہِ سکوں بھی، غارت گر بھی

کانٹا کانٹا راہِ وفا کا
راحتِ دل بھی جانِ جگر بھی

چاہے رک جا چاہے بڑھ جا
منزل ہے اک راہ گزر بھی

عشق نہ جب تک روح رواں ہو
دل بھی ہے بیکار، نظر بھی

اُف کتنی بے درد ہے دنیا
ہنستی ہے چیخیں سن کر بھی

مجبوروں کو ہنسنا ہوگا
درد سے بے قابو ہوکر بھی

عقل کے احسانات مسلّم
عقل ہے لیکن غارت گر بھی

وہ دیکھو وہ حفیظؔ آتا ہے
دیوانہ! دیوانہ گر بھی

☆☆

☆
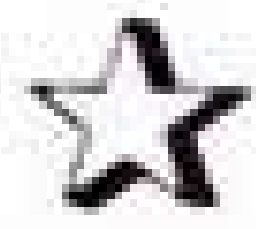
ہم توجہ کے سزاوار نہ تھے
سیدھے سادے تھے اداکار نہ تھے

ہم سے کیوں بچ کے زمانہ گزرا
ہم کوئی سنگ نہ تھے خار نہ تھے

اس لئے گر گئے نظروں سے تری
ہم ترے حاشیہ بردار نہ تھے

اِن کو تو چارہ گروں نے مارا
اِتنے بیمار یہ بیمار نہ تھے

دیکھتے رہ گئے حق دار سبھی
لے اُڑے چند جو حق دار نہ تھے

بات منصب سے نہ دولت سے بنی
کیونکہ ہم صاحبِ کردار نہ تھے

پاس آکر بھی کوئی کیا لیتا
ہم کوئی سایہ دیوار نہ تھے

خوفِ رسوائی سے پیچھا چھوٹا
دشت میں کوچہ و بازار نہ تھے

مول پانی کے بکا خونِ جگر
مطمئن پھر بھی خریدار نہ تھے

ہم تھے رندوں کے بھی غمخوار حفیظؔ
یہ الگ بات کہ مے خوار نہ تھے

★★

☆
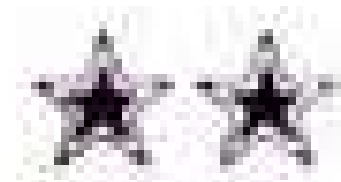
اندھیروں سے ڈرے کیوں دل ہمارا
بہت روشن ہے مستقبل ہمارا

شہیدِ جستجو ہوکر تو دیکھیں
پتہ پوچھے گی خود منزل ہمارا

نہ دیکھیں گے چمن برباد ہوتے
کہ اس میں خون ہے شامل ہمارا

ضروری ہے کفن بردوش رہنا
وطن ہے کوچہ قاتل ہمارا

ضمیروں کو چبھن بخشی ہے ہم نے
اثر ہوتا نہیں زائل ہمارا

ہماری معترف دل سے قدامت
دماغِ عصرِ نو قائل ہمارا

اِدھر طوفاں سے ہم دست و گریباں
اُدھر ہے منتظر ساحل ہمارا

کہیں زخمی ہیں ہم تیغِ ستم کے
کہیں قاتل ہے خود بسمل ہمارا

بدی سے برسرِ پیکار ہیں ہم
ہدف ہے ہر جگہ باطل ہمارا

ہمیں روکے گی کیا دیوارِ تہمت
محرک ہے خلوصِ دل ہمارا

ہمارے آنسوؤں کو التجا کو
ترستا رہ گیا قاتل ہمارا

★★

☆

تخریب کی زد میں جب تعمیر نظر آئی
تدبیر پرستوں کو تقدیر نظر آئی

افکار کے دھارے کو کس بند نے روکا ہے
کب وقت کے پاؤں میں زنجیر نظر آئی

ہم کو تو اٹھا لائی اس بزم سے خودداری
جب اُن کی توجہ میں تاخیر نظر آئی

الفاظ کے پھولوں نے نشتر کی چبھن دی ہے
لہجے میں ذرا بھی جب تحقیر نظر آئی

سادہ سی مری بستی جو حسن سے عاری ہے
پردیس سے لوٹا تو کشمیر نظر آئی

مچلے ہیں حفیظؔ اپنے ارمان اسیری کے
جب کوئی قرینے کی زنجیر نظر آئی

★★

☆
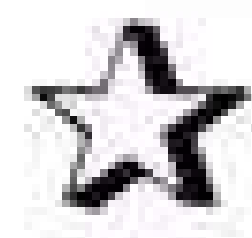
اس میں کچھ لطف نہ آیا جو بہاروں میں کٹی
وہ مزا دے گئی جو زندگی خاروں میں کٹی

آستینوں میں چھپائے ہوئے خنجر تھے یہی
دشمنوں میں نہیں گردن مری یاروں میں کٹی

زندگی کو بڑی امیدیں ہیں مستقبل سے
وہ ستاروں پہ بھی گزرے گی جو غاروں میں کٹی

یہ ہے اپنا، یہ پرایا ہے، یہ دشمن ہے، یہ دوست
عمر انسان کی ایسے ہی حصاروں میں کٹی

عیش سامانیاں کیا جانے کدھر لے جاتیں
خیر گزری کہ حفیظ اپنی گزاروں میں کٹی

☆☆

☆
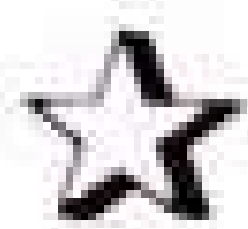
یہ بات نرالی دلِ خوددار کرے ہے
تڑپے ہے مگر درد سے انکار کرے ہے

دنیا کا یہ انداز سمجھ میں نہیں آتا
دیکھے ہے حقارت سے کبھی پیار کرے ہے

تسلیم اُسے کوئی بھی دل سے نہیں کرتا
وہ فیصلہ جو جبر کی تلوار کرے ہے

اُس دشمنِ ایماں نے کیا شیخ پہ جادو
کافر جو کہے ہے وہی دیندار کرے ہے

اب اپنے بھی سائے کا بھروسہ نہیں یارو!
نزدیک جو آئے ہے وہی وار کرے ہے

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

شرماتا ہوں فنکار سمجھتے ہوئے خود کو
جب جھوٹی خوشامد کوئی فنکار کرے ہے

یہ ناچتی گاتی ہوئی اس دور کی تہذیب
کیا جانئے کس کرب کا اظہار کرے ہے

مانگے ہے حفیظؔ اور ہی کچھ شعر کا بازار
کچھ اور طلب شعر کا معیار کرے ہے

☆☆

☆
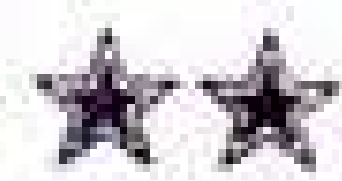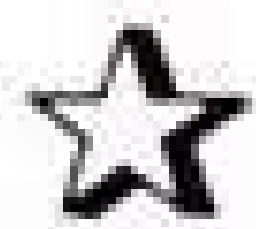
کھینچ بھی ڈالئے رگ رگ سے لہو
یوں پیالہ نہ بھرے گا صاحب

شوق سے آپ قیامت ڈھائیں
کوئی اف تک نہ کرے گا صاحب

برف بن جائیں گے آخر سب لوگ
برف پر رقص کرے گا صاحب

مجھ کو مظلوم سے ڈر لگتا ہے
یہ مجھے قتل کرے گا صاحب

تنگ آکر یہی کہتے ہیں غلام
جانے کس روز مرے گا صاحب

★★

☆
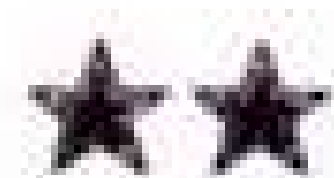
تبصرہ کیا کریں اب اپنے طرف داروں پر
ہم کو دروازوں کا دھوکا ہوا دیواروں پر

تہمتِ غم نہ لگا ہم سے جگر داروں پر
زخم ہنستے ہیں جفاکار ترے واروں پر

جب وہ آئے ہی نہیں بجھ گئی شمعِ امیّد
اب کوئی روشنی در پر ہے نہ دیواروں پر

آشیاں جلتے رہے، پھُنکتے رہے، مٹتے رہے
بلبلیں جان چھڑکتی رہیں گلزاروں پر

حاکمِ شہر ہُوا جان کا دشمن یارو!
اور تنقید کرو حاشیہ برداروں پر

شدّتِ برہمیِ پیرِ مغاں کیا کہئے
پارسائی کا بھی الزام ہے میخواروں پر

جب کسی اہلِ نظر نے کہیں آنکھیں کھولیں
بجلیاں ٹوٹ پڑیں وقت کے اندھیاروں پر

سلسلہ چھیڑ دیا دست درازی کا حفیظؔ
کس کا سایہ پڑا تہذیب کے معماروں پر

★★

☆
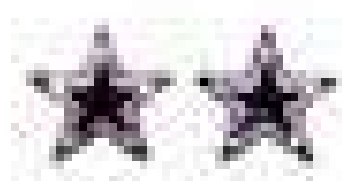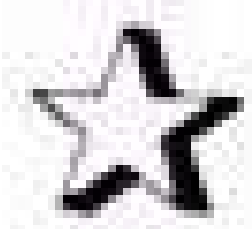
اس دورِ بے ضمیر میں جینا سکھا دیا
حالات نے ہمیں بھی منافق بنا دیا

جب اُس نے میرے فن کا مجھے واسطہ دیا
اک نام اپنی نظم سے میں نے ہٹا دیا

جینے ہی دے مجھے نہ وہ مرنے ہی دے مجھے
خنجر چلا دیا کبھی مرہم لگا دیا

پھر داغدار ہو گیا دامانِ گلستان
لو آج پھر کسی نے نشیمن جلا دیا

دیتے پھرو ثبوتِ وفا اب جہاں تہاں
الزام بے وفائی کا اُس نے لگا دیا

ہتھیار پہلے عقل نے ڈھالے نئے نئے
دنیا کو پھر جنوں کا نشانہ بنا دیا

چنگاریوں کو اب کوئی پاگل، ہوا نہ دے
شعلہ تو جیسے ہو سکا ہم نے بجھا دیا

معیارِ زندگی کو اٹھانے کے شوق نے
کردار پستیوں سے بھی نیچے گرا دیا

یہ بھی تو سوچیے کبھی تنہائی میں ذرا
دنیا سے ہم نے کیا لیا؟ دنیا کو کیا دیا؟

بربادیوں سے لینا ہے کچھ کام اے حفیظؔ
یوں مرثیے کو ہم نے ترانہ بنا دیا

★★

☆
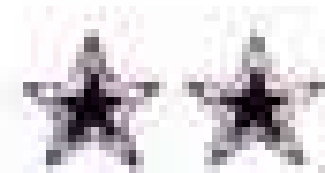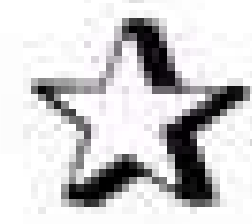
چھیڑ دو دل کی داستاں لوگو
آپ بندھ جائے گا سماں لوگو

مشکلیں اس میں ہیں کہاں لوگو
ہم نہ دیں گے یہ امتحاں لوگو

ڈھونڈنے سے بھی ہمنوا نہ ملا
مجھ کو اے میرے ہم زباں لوگو

میں نے اقبالِ جرم کر تو لیا
دیر اب کیا ہے حکمراں لوگو

ظلم تھک کر سوال کرتا ہے
کیوں نہیں مرتے سخت جاں لوگو

تب جمیں گے قدم جزیرے میں
جب جلا دو گے کشتیاں لوگو

دیکھ پاؤ گے کیا گھروں کے زخم
راستے کے رواں دواں لوگو

ہم اگر ترکِ گفتگو نہ کریں
اور بڑھ جائیں تلخیاں لوگو

جن کو اہلِ خرد کا ہاتھ لگا
اور الجھیں وہ گتھیاں لوگو

بات جب ہے کہ فاصلہ نہ رہے
فکر اور فن کے درمیاں لوگو

کھوئے کھوئے حفیظؔ پائے گئے
امتحاں پھر ہے امتحاں لوگو

★★

☆
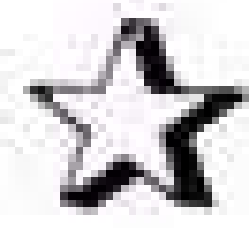
ٹھٹک گئی ہے ہوس مصلحت کے پاس آکر
وفا گزر بھی گئی تخت و تاج ٹھکرا کر

اِنھیں یہ طنز کے تیروں کی طرح لگتا ہے
سِتم زدوں سے نہ ہنس کر مزاج پوچھا کر

نہ جانے چشمِ عنایت میں کیا نظر آیا
غریب رو دیا دامن کو اپنے پھیلا کر

مجھے یہ مشورہ خوشحال لوگ دیتے ہیں
ضمیر بیچ دے اپنا' خودی کا سودا کر

فضا پہ چھائی ہے مایوسیوں کی تاریکی
مرے یقین! مری راہ میں اجالا کر

یہ لغزشیں ہی سنبھلنا تجھے سکھا دیں گی
قدم قدم پہ سہاروں کا منہ نہ دیکھا کر

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

حفیظؔ کو بھی ہے تائیدِ ظلم کی. تاکید
یہ لوگ شمع سے کہتے ہیں تو اندھیرا کر

★★

☆
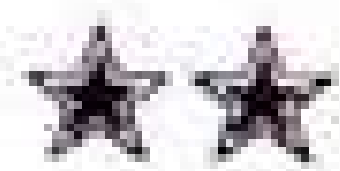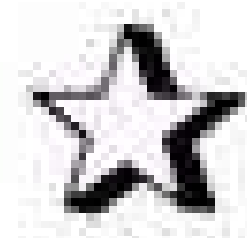
جانتے ہیں وہ حقیقت کو چھپا کر رکھنا
قتل کرنا جسے الزام اُسی پر رکھنا

حاکمِ وقت پہ جس وقت میں تنقید کروں
ہاتھ اس وقت نہ یارو مرے منھ پر رکھنا

اس سے خونریزی کی لت بھی نہیں چھوڑی جاتی
تمغہ امن بھی چاہے وہ ستم گر رکھنا

زر پرستوں کا تو اک کھیل ہے کردار کُشی
واسطہ ان سے ذرا سوچ سمجھ کر رکھنا

جانے کب منھ سے نکل جائے کوئی کام کی بات
ربط ہم خانہ خرابوں سے برابر رکھنا

آج تصویر تو اک قصہ پارینہ ہے
پاس اپنے مری آواز کے پیکر رکھنا

اس سے ذہنوں کی بلندی کا پتہ چلتا ہے
نام ذرّوں کے تم اپنے مہ و اختر رکھنا

اچھے اچھوں کے یہاں پاؤں اکھڑ جاتے ہیں
جادۂ حق پہ قدم خوب جما کر رکھنا

خونِ تقویٰ کی کوئی رند نہ بُو پا جائے
ساقیا اچھی طرح جام کو دھو کر رکھنا

آسماں اس سے بہت دور ہے عظمت کا حفیظؔ
آشیاں فن کا نہ شہرت کے شجر پر رکھنا

★★

☆
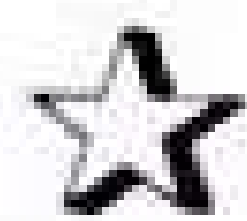
بے ضمیروں کو بتانے جائیں کیا
وہ نہ سمجھیں گے انھیں سمجھائیں کیا

آ گئے وہ آ گئے اہلِ ہوس
اب تری محفل سے ہم اٹھ جائیں کیا

باخبر تھے عشق کے انجام سے
عشق کے انجام پر پچھتائیں کیا

التجائیں تو کوئی سنتا نہیں
اب ذرا کچھ بے ادب ہو جائیں کیا

آپ کے وعدے بہت بدنام ہیں
آپ کے وعدوں سے دل بہلائیں کیا

بے عصا اپنی کلیمی ہے تو ہو
وقت کے فرعون سے ڈر جائیں کیا

اُن کے مجرم آ گئے اُن کے حضور
دیکھئے وہ فیصلہ فرمائیں کیا

خیر سے مقتل میں نقارے بھی ہیں
دور تک چیخیں ہماری جائیں کیا

شیخ قاتل کو مسیحا کہہ گئے
محترم کی بات کو جھٹلائیں کیا

چھوڑ کر دامانِ خودداری حفیظؔ
اپنی نظروں سے بھی ہم گر جائیں کیا

★★

☆
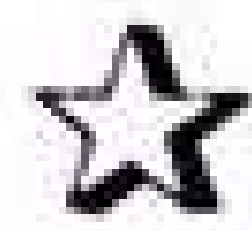
آج کچھ ایسا طے پایا ہے حق کے اجارہ داروں میں
ہم پر جو ایمان نہ لائیں چنوا دو دیواروں میں

کون سی ہے تصویر ہماری کاش بتا دے کوئی ہمیں
چہروں پر چھائی ہے اداسی رونق ہے بازاروں میں

سورج کو دو دیس نکالا' دن کا قصہ پاک کرو
بنتے ہیں ایسے منصوبے رات کے رشتے داروں میں

غم بھی اک احسان ہے اس کا' شکر کر اے دل شکوہ کیا
غم تو ہماری روح رواں ہے' ہم نہیں غم کے ماروں میں

رازق پر کرتے ہیں بھروسہ اور نہ اپنی کوشش پر
خوشحالی کو ڈھونڈ رہے ہیں جو خالی گھواروں میں

اُس کی ہاں میں ہاں نہ ملائی بس یہ جرم ہمارا ہے
واعظ نے شامل کر ڈالا ہم کو بھی میخواروں میں

اک جابر کا مجبوروں نے ایسے استقبال کیا
آ نکلا ہو کوئی مسیحا جیسے درد کے ماروں میں

ہر ظالم سے ٹکّر لی ہے سچّے فنکاروں نے حفیظؔ
ہم وہ نہیں جو ڈر کر کہہ دیں "ہم ہیں تابعداروں میں"

★★

☆
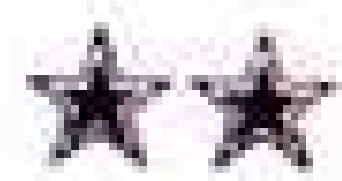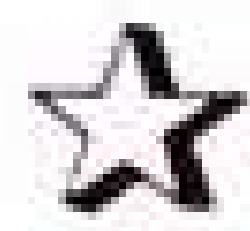
مظلوموں کی آہ و فغاں پر برہم کیوں ہو جاتے ہو
شوق نہیں رونے کا ہم کو، تم ہی تو رُلواتے ہو

ہم بھی تو انسان ہیں آخر، ہم سے یہ نفرت کیسی؟
سب سے لپٹ کر ملنے والو، ہم سے کیوں کتراتے ہو

ہمسایوں سے، ہم وطنوں سے لاشیں پوچھا کرتی ہیں
پیار کی باتیں کرنے والو، قاتل کیوں بن جاتے ہو

پیتے تھے جب تک پیتے تھے، چھوڑی تو بس چھوڑ ہی دی
تم بھی بہکنا چھوڑو یارو، ہم کو کیوں بہکاتے ہو

ہم تو چلو جذباتی ٹھہرے اپنی کہو دانش مندو!
ٹھیس انا کو جب لگتی ہے، تم پاگل ہو جاتے ہو

ہم نے تمھارے ہاتھوں سے بھی سر پہ کفن بندھوایا تھا
تم بھی سرخ سویرے والو درباری ہو جاتے ہو

دیکھو یہ پندارِ تقویٰ ٹھیک نہیں ہے مولانا!
شعر وادب کا ذکر چھڑے تو چیں بہ جبیں ہو جاتے ہو

کومل کومل غزلوں میں طوفانوں کے پیغام حفیظؔ
میٹھی میٹھی باتوں سے بھی تم تو آگ لگاتے ہو

★★

☆
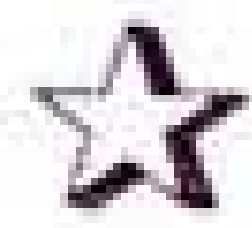
جانے کتنے ہنگاموں کی اس میں سمائی ہوتی ہے
سناٹے کی گہرائی بھی کیا گہرائی ہوتی ہے

ہم نے دل کے داغ چھپائے مسکانوں کے پھولوں سے
سن رکھا تھا چہرے سے بھی غم پیمائی ہوتی ہے

اپنے آپ سے کیا مل پاتے ایسے بھیڑ بھڑکے میں
عمر اِسی امید میں گزری اب تنہائی ہوتی ہے

ایسے موقع پر مت چھونا بھول کے اپنے دامن کو
اِس سے رونے والے کی ہمت افزائی ہوتی ہے

ان کے تغافل کی میں جب بھی ان سے شکایت کرتا ہوں
کہتے ہیں "اپنوں کے لئے ہی بے پروائی ہوتی ہے"

واعظ بھی آرام طلب ہیں، قائد بھی آرام طلب
راہبری تو مشکل ہے ہاں راہنمائی ہوتی ہے

درباری ماحول میں جینا مشکل ہے ہم لوگوں کا
یا تو دم گھٹ جاتا ہے یا تلخ نوائی ہوتی ہے

جو محسوس کیا کہہ بیٹھے سیدھے سادے لفظوں میں
ہم دیوانے کیا جانیں کیا شے دانائی ہوتی ہے

دل کا خون قلم سے ٹپکے تب تو ہے کچھ بات حفیظؔ
یوں ہونے کو کتنی ہی خامہ فرسائی ہوتی ہے

★★

☆
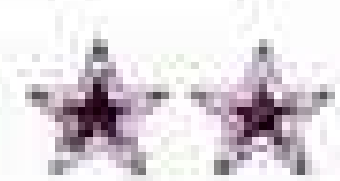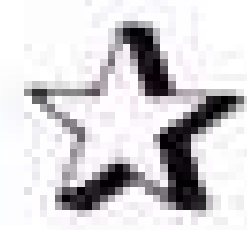
آباد رہیں گے ویرانے، شاداب رہیں گی زنجیریں
جب تک دیوانے زندہ ہیں پھولیں گی پھلیں گی زنجیریں

آزادی کا دروازہ بھی خود ہی کھولیں گی زنجیریں
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی جب حد سے بڑھیں گی زنجیریں

جب سب کے لب سل جائیں گے ہاتھوں سے قلم چھن جائیں گے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں

اندھوں بہروں کی نگری میں یوں کون توجہ کرتا ہے
ماحول سنے گا، دیکھے گا جس وقت بجیں گی زنجیریں

جو زنجیروں سے باہر ہیں، آزاد انھیں بھی مت سمجھو
جب ہاتھ کٹیں گے ظالم کے اس وقت کٹیں گی زنجیریں

یہ طور بھی ہیں صیادی کے، یہ ڈھنگ بھی ہیں جلادی کے
سمٹیں سکڑیں گی زنجیریں، پھیلیں گی، بڑھیں گی زنجیریں

مجبوروں کو ترسائیں گی، یوں اور ہمیں تڑپائیں گی
زلفوں کی یاد دلائیں گی جب لہرائیں گی زنجیریں

زنجیریں تو ہٹ جائیں گی، ہاں ان کے نشاں رہ جائیں گے
میرا کیا ہے ظالم تجھ کو بدنام کریں گی زنجیریں

لے دے کے حفیظؔ ان سے ہی تھی امیدِ وفا دیوانوں کو
کیا ہوگا جب دیوانوں سے ناتہ توڑیں گی زنجیریں

★★

☆
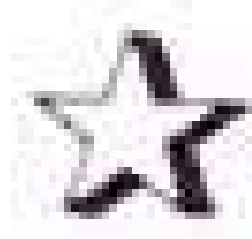
اِس دیوانے دل کو دیکھو کیا شیوہ اپنائے ہے
اُس پر ہی وشواس کرے ہے جس سے دھوکہ کھائے ہے

سارا کلیجہ کٹ کٹ کر جب اشکوں میں بہہ جائے ہے
تب کوئی فرہاد بنے ہے، تب مجنوں کہلائے ہے

میں جو تڑپ کے روؤں ہوں تو ظالم یوں فرمائے ہے
اِتنا گہرا گھاؤ کہاں ہے، ناحق شور مچائے ہے

اس کو ہی زنجیر کہے ہیں شاید یہ دیوانے لوگ
زنداں کے دروازے پر یہ زلف سی جو لہرائے ہے

تم نے مجھ کو رنج دیا تو اس میں تمہارا دوش نہیں
پھول بھی کانٹا بن جائے ہے وقت بُرا جب آئے ہے

ایسے نرالے فریادی کی کیسے ہوگی دادرسی؟
پہلے تو فریاد کرے ہے، پھر آنسو پی جائے ہے

میں بھی پھروں ہوں مارا مارا چھوڑ کے تیرے دامن کو
پیڑ سے جو پتا ٹوٹے ہے، آوارہ ہو جائے ہے

پوچھے ہے یاں کون میاں اربابِ علم و دانش کو
جو چلّا کر بولے ہے وہ محفل پر چھا جائے ہے

صرف زباں کی نقالی سے بات نہ بن پائے گی حفیظؔ
دل پر کاری چوٹ لگے تو میر کا لہجہ آئے

★★

☆
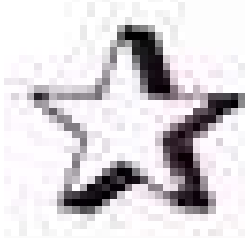
روناہے کہاں، ہنسنا ہے کہاں، یہ بات مرا دل جانے ہے
تنہائی کا مطلب سمجھے ہے مفہومِ محفل جانے ہے

گر اپنے گھاؤ دکھاؤ گے، سولی پہ چڑھائے جاؤ گے
اس شہر کا منصف ایسا ہے، بسمل کو جو قاتل جانے ہے

اے دل نہ دکھا دربار مجھے ہاں لے چل سوئے دار مجھے
تو خوب مجھے پہچانے ہے کس کے ہوں قابل جانے ہے

ان اہلِ علم و دانش کے، ناقص ہیں سارے منصوبے
انساں کو بنانے والا ہی، انساں کے مسائل جانے ہے

ہم جینے سے تو اوب گئے، مرنے سے مگر یوں ڈرتے ہیں
جو بویا ہے وہ کاٹیں گے، کیا بویا ہے، دل جانے ہے

اے ایسے ویسے فنکارو! مانو کہ بُرا فن کار ہے وہ
تشہیر کی کاوش کو بھی جو تخلیق میں شامل جانے ہے

کردار بھی زد میں آتے ہیں معیار بھی زد میں آتے ہیں
ہنگامۂ محفل کو محفل جب گرمیِ محفل جانے ہے

میری ہی کمی ہے یہ شاید یا اس کے دل کا کھوٹ حفیظؔ
میں جس کو اپنا سمجھوں ہوں وہ مجھ کو مقابل جانے ہے

★★

☆
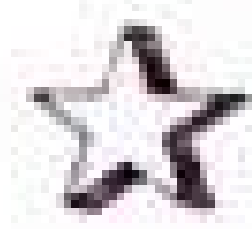
اچھی طرح ذرا مجھے پہچان زندگی
انسان ہوں میں حضرتِ انسان زندگی

مجھ سے ترے حصار میں ٹھہرا نہ جائے گا
میدان میرے واسطے میدان زندگی

ہم نے لکھا ہے اپنے شہیدوں کے خون سے
مقتل کی داستان کا عنوان زندگی

پہنے ہوئے ہے ریشم و کمخواب کا کفن
یارانِ بے ضمیر کی بے جان زندگی

من مانیوں کا راج ہے سارے سماج میں
جیسے ہو کوئی عہد نہ پیمان زندگی

باطل کے اقتدار پہ چیں بر جبیں نہیں
حق کے سپاہیوں کی تن آسان زندگی

غیروں سے پوچھتی ہے طریقہ نجات کا
اپنوں کی سازشوں سے پریشان زندگی

وہ زخم ہوں کہ جس پہ بڑے اہتمام سے
خالی کرے ہے اپنے نمکدان زندگی

کم ظرف محسنوں کا ستایا ہوا ہوں میں
مجھ پر نہ کیجیو کوئی احسان زندگی

میں نے بُرا کیا جو تجھے بے وفا کہا
اپنے حفیظؔ کا نہ بُرا مان زندگی

★★

☆
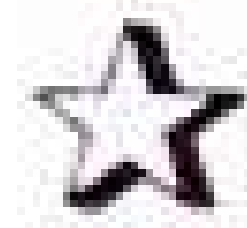
سمجھ رہا تھا کہ محفوظ اپنے گھر میں ہوں
مگر یہ گھر نے بتایا کہ میں بھنور میں ہوں

یہ اور بات مداوا مجھے نصیب نہ ہو
یہی بہت ہے کہ فہرستِ چارہ گر میں ہوں

تجھے قفس سے رہائی دلا نہیں سکتا
کہ خود اسیر میں زندانِ بال و پر میں ہوں

یہ دیکھنا ہے کہ میداں میں آئیں گے کتنے
ابھی پیام لئے گشتِ در بدر میں ہوں

گرا دیا مجھے کس نے ہوس کے قدموں پر
یہ کیسے بھول گیا میں تری نظر میں ہوں

مرے شعور نے رکھا مجھے غرور سے دور
میں آسماں پہ سہی پھر بھی رہگزر میں ہوں

جھلسے ہاتھ سے پھر دوپہر اٹھا لے گی
شگفتہ ہوں کہ ابھی دامن سحر میں ہوں

میں وقت ہوں مری تقدیر میں قیام نہیں
حفیظ روزِ ازل ہی سے میں سفر میں ہوں

★★

☆
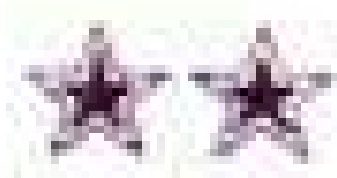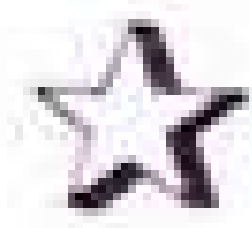
رودادِ غم پنہاں کیا لکھّی ہے چہرے پر
سب مجھ سے یہ کہتے ہیں راتوں کو نہ جاگا کر

گر تجھ سے میں ٹکراؤں، پل بھر میں بکھر جاؤں
میں اپنی جگہ شیشہ، تو اپنی جگہ پتّھر

"ٹکرار سے کیا حاصل، مل جل کے گزر کر لیں"
کل رات یہ کہتا تھا رہزن سے مرا رہبر

عیّاری نہیں ہے یہ، فنکاری ہے فنکاری
اشعار سنا تھوڑے، تقریر زیادہ کر

تنقید سے شاعر کی تقدیر سنورتی ہے
تعریف کے متوالے تنقید گوارا کر

شہرت کی مشینوں نے نام اس کا اچھالا ہے
مشہور ہے جتنا وہ اتنا نہیں قد آور

گاہک کی ضرورت کو یہ خوب سمجھتے ہیں
اب چہرے بھی رکھتے ہیں آئینوں کے سوداگر

خود اہلِ نظر ہیں یہ تُو شعر سناتا جا
سمجھا نہ حفیظؔ اِن کو اشعار کے پس منظر

★★

☆
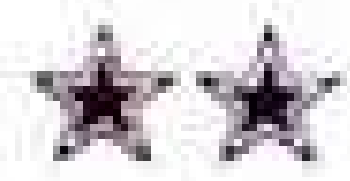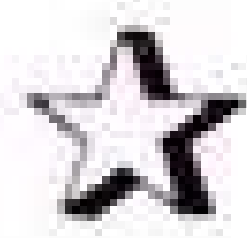
زندگی کی بے پناہی کا مداوا کیا کرے
چلچلاتی دھوپ میں زلفوں کا سایا کیا کرے

کہہ دیا دنیا سے ہم نے "ہم تو حق کے ساتھ ہیں"
دیکھنا ہے اب ہمارے ساتھ دنیا کیا کرے

ہر سہارا بے عمل کے واسطے بیکار ہے
آنکھ ہی کھولے نہ جب کوئی اُجالا کیا کرے

اس سے پہلے آدمی کی اتنی بے قدری نہ تھی
سوچتی ہے آج دنیا آدمی کا کیا کرے

تھم گئے آنسو جب اُس نے رکھ دیے آنکھوں پہ ہاتھ
راستے ہی بند ہو جائیں تو دریا کیا کرے

حُسن کے نزدیک ہم ہوتے گئے ہوتے گئے
کوئی دامن زد میں آجائے تو شعلہ کیا کرے

کچھ تو ہوگی رکھ رکھاؤ کی بھی آخر انتہا!
غم اگر حد سے زیادہ ہو تو چہرہ کیا کرے

رنجِ فرقت ہے محبّت کا مقدّر اے حفیظؔ
اس میں رادھا کیا کرے اس میں کنھیّا کیا کرے

★★

☆
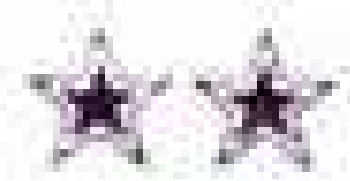
اس لئے ارمان قاتل کے ابھی نکلے نہیں
مرنے والے مر گئے چپ چاپ کچھ تڑپے نہیں

جس نے جو چاہا اُسے اپنا بنا کر لے لیا
جانتے تھے سب، کسی سے ہم کبھی لڑتے نہیں

خون تھکوا دیں اگر مرنے کی جی میں ٹھان لیں
جتنا تم سمجھے ہوئے ہو اتنے ہم بودے نہیں

جبر تھا تاریخ کا یا اور کوئی بات تھی
مسئلے الجھے کچھ ایسے آج تک سلجھے نہیں

جانے کیا کیا لے گئے اور دے گئے ہیں بس فریب
اجنبی مہمان میرے صبح تک ٹھہرے نہیں

مجھ کو یہ احساس میں اتنا بھی جھک کر کیوں ملا
اور حضرت کو یہ غصہ ہاتھ کیوں چومے نہیں

اس کے بیٹے کی بھی کیوں تعریف اس سے کیجئے
جانے اب ان کے مراسم کیسے ہیں کیسے نہیں

تبصرہ ہم بھی کریں گے تیرنے والوں پہ آج
گرچہ پانی میں کبھی ہم آج تک اترے نہیں

فن سے جو فنکار خالی تھے وہ کیا پاتے مقام
یار لوگوں نے ابھارا تو مگر ابھرے نہیں

اس عیادت سے تسلی بھی ہوئی تکلیف بھی
کچھ ترس کھا کر مجھے دیکھا مگر بولے نہیں

آہ یہ بے فیض اہلِ شان و شوکت اے حفیظ
ایسے محلوں کی طرح ہیں جن میں دروازے نہیں

★★

☆
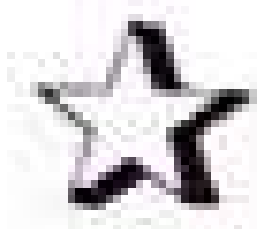
ستم کے بیکار سب ہتھیار ہو جائیں گے آپ
جس گھڑی فریاد سے للکار ہو جائیں گے آپ

ہر ادا کے ان گنت مفہوم گنواتے ہیں لوگ
کیا خبر تھی اس قدر تہ دار ہو جائیں گے آپ

روز ترکِ جور کا احساں جتایا جائے گا
اس طرح بھی درپئے آزار ہو جائیں گے آپ

کہنے سننے سے زیادہ بات بڑھ جائے گی اور
مختصر یہ ہے کہ وہ ہموار ہو جائیں گے آپ

اپنی عظمت کے قصیدے خود سنائیں گے اگر
حلقہ اہلِ نظر میں خوار ہو جائیں گے آپ

ایک سُونا پن رہے گا آرزوؤں کے بغیر
حضرتِ دل! دہرِ بے بازار ہو جائیں گے آپ

باری باری جاگنا ہے خوف سے شبخون کے
ہم تبھی سوئیں گے جب بیدار ہو جائیں گے آپ

ناز برداری نہ کیجے اہلِ دولت کی حفیظؔ
رفتہ رفتہ حاشیہ بردار ہو جائیں گے آپ

★★

☆
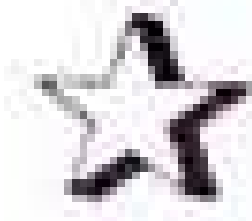
دل فروشوں کے لئے کوچہ و بازار بنے
اور جانبازوں کی خاطر رسن و دار بنے

بس یہی دوڑ ہے اِس دَور کے انسانوں کی
تیری دیوار سے اونچی مری دیوار بنے

چھین کر غیر سے اپنوں نے مجھے قتل کیا
آپ ہی ڈھال بنے، آپ ہی تلوار بنے

ہو گئے لوگ اپاہج یہی کہتے کہتے
ابھی چلتے ہیں ذرا راہ تو ہموار بنے

مجھ کو ممنونِ کرم کرکے وہ فرماتے ہیں
آدمی سوچ سمجھ کر ذرا خوددار بنے

خودشناسی کے نہ ہونے سے یہی ہوتا ہے
جن کو فن کار نہ بننا تھا وہ فن کار بنے

تجھ سے کتنا ہے ہمیں پیار کچھ اندازہ کر
ہم ترے چاہنے والوں کے روادار بنے

جب مجھے اپنا کہا ہے تو پھر اپناؤ بھی
دام اونچے جو لگائے وہ خریدار بنے

شان و شوکت کے لئے تُو ہے پریشان حفیظؔ
مجھ کو یہ فکر کہ کیسے ترا کردار بنے

★★

☆
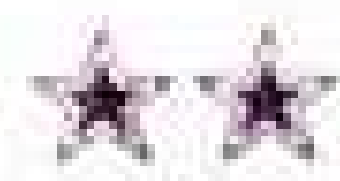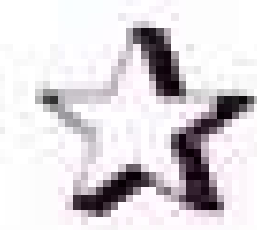
گدازِ دل سے ملا، سوزشِ جگر سے ملا
جو قہقہوں میں گنوایا تھا چشمِ تر سے ملا

تعلقات کے اے دل ہزار پہلو ہیں
نہ جانے مجھ سے وہ کس نقطۂ نظر سے ملا

کبھی تھکن کا کبھی فاصلوں کا رونا ہے
سفر کا حوصلہ مجھ کو نہ ہم سفر سے ملا

میں دوسروں کے لئے بے قرار پھرتا ہوں
عجیب درد مجھے میرے چارہ گر سے ملا

ہر انقلاب کی تاریخ یہ بتاتی ہے
وہ منزلوں پہ نہ پایا جو رہگزر سے ملا

نہ میں نے سوز ہی پایا نہ استقامت ہی
حجر حجر کو ٹٹولا، شجر شجر سے ملا

جدا ہے سارے زمانے سے اپنے فن کا مزاج
نہ کوہکن سے ملا اور نہ شیشہ گر سے ملا

حفیظؔ ہو گیا آخر اجل سے ہم آغوش
تمام شب کا ستایا ہوا سحر سے ملا

★★

☆
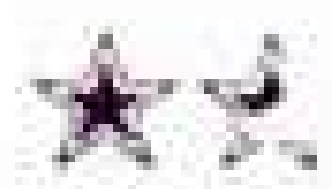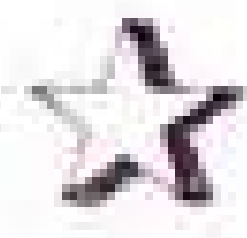
فاصلہ وہ شے ہے جس کو پردۂ حائل کہیں
تم اگر نزدیک آجاؤ تو رازِ دل کہیں

حسن کے سانچے میں ڈھالیں عشق کی رودادِ غم
دل کو محمل داغِ دل کو لیلیِ محمل کہیں

بڑھ گئی ہے کس قدر اِس روشنی کے دور میں
علم کی وہ تیرگی جس کو حجابِ دل کہیں

اب بھلا بانگِ جرس کی کیا ضرورت رہ گئی
حوصلے منزل کو جب گردِ رہِ منزل کہیں

سازو ساماں تو بہت اِس دور میں لیکن حفیظؔ
وہ میسّر ہی نہیں جس کو سکونِ دل کہیں

★★

☆
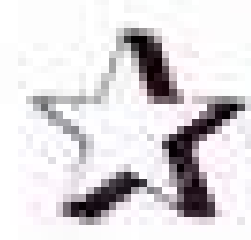
اگر سب کچھ بھی چھن جائے تو کیا غم
رضا ہے آپ کی حاصل ہمارا

قیامت ڈھا گیا حرفِ تسلّی!
بہت دیکھا ہوا تھا دل ہمارا

خرد تیرے جنوں سے بھی نبٹنے
اٹھے گا کوئی صاحب دل ہمارا

سدا ہم نے خدا لگتی کہی ہے
یہی کردار ہے اے دل ہمارا

★★

☆
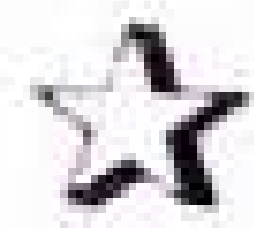
کیا شکوہ کیسی فریاد
جبرِ مسلسل زندہ باد

وہ ٹوٹا وہ ڈھیر ہوا
قصہ ظلم کی کیا بنیاد

سنگ کی خیر نہ سر کی خیر
اب تیشہ ہے اور فرہاد

جن کے لئے ہم قتل ہوئے
اہلِ گلشن شاد آباد

★★

☆
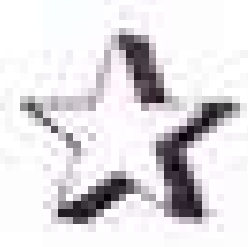
ہنگامۂ وجود کا دیتی نہیں جواب
یہ اہلِ خانقاہ کی سنسان زندگی

یہ قہقہے نہیں ہیں شبستانِ عیش میں
کرتی ہے اپنی موت کا اعلان زندگی

رسوائیوں سے مجھ کو بچا لے مرے خدا
کرتی ہے چاک میرا گریبان زندگی

یہ نرم بستروں پہ پنپتی نہیں حفیظؔ
چڑھتی ہے سختیوں ہی میں پروان زندگی

★★

☆
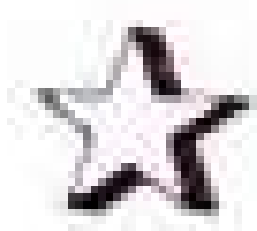
مجھ کو سرمایہ معتبر مل گیا
جس میں سودا ہے تیرا وہ سر مل گیا

بڑھ گئی حد سے جب رات کی تیرگی
تیرگی سے پیامِ سحر مل گیا

دھڑکنوں کے لئے درد کے واسطے
ایک دل مل گیا، اک جگر مل گیا

مل گئیں تیرے پیکر کو رعنایاں
میری آنکھوں کو ذوقِ نظر مل گیا

کیا ملا ہم کو دنیا سے غم کے سوا
اور یہ بھی ترے نام پر مل گیا

اپنی فریاد سے خود ہی نادم ہوں میں
میری فریاد میں شوروشر مل گیا

کیا خبر تھی کہ الجھے گا ہر گام پر
میں تو خوش تھا مجھے ہم سفر مل گیا

یہ جو احباب ہیں مدح خوانِ حفیظؔ
قدردانوں کو اک بے ہنر مل گیا

★★

☆
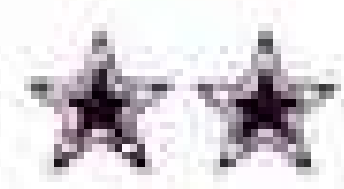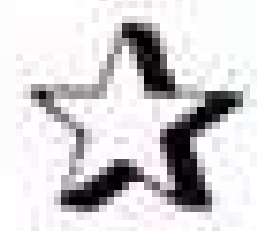
دنیا کو بچائے گی کہ خود وار کرے گی
اب عقل ادا کون سا کردار کرے گی

جو کارِ نمایاں کیے دنیا میں قلم نے
وہ کام نہ ہرگز کبھی تلوار کرے گی

تقدیر کا کیا ہے یہ بنی ہے تو بنی ہے
بگڑے گی تو دشمن کی طرح وار کرے گی

نفرت کی یہ دیوار یہاں کس نے اٹھا دی
برباد مرے گھر کو یہ دیوار کرے گی

جب ظلم پہ تنقید نہ کر پائے گا کوئی
یہ فرض ادا جرأتِ فنکار کرے گی

معلوم نہ تھا ناز کی نخوت کی سیاست
اظہارِ ندامت سرِ بازار کرے گی

ق

اربابِ حکومت کی جو موجودہ روش ہے
وہ بھی اسی انجام سے دوچار کرے گی

اک روز حفیظؔ آپ کی آزاد کلامی
پھر آپ کو زنداں کا سزاوار کرے گی

★★

☆
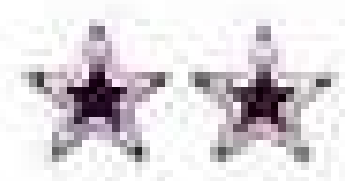
اک بار زندگی جو ملی بے رخی کے ساتھ
دیکھا نہ پھر کسی نے ہمیں زندگی کے ساتھ

اے سنگ دل نہ کھیل مری بے بسی کے ساتھ
تاریخ تجھ کو یاد کرے گی بدی کے ساتھ

شہرہ جہاں میں جس کی وفا دشمنی کا ہے
باندھا ہے اپنے ہاتھ سے دامن اسی کے ساتھ

بادہ کشوں کے ظرف کا کھل جائے گا بھرم
ساقی کا التفات ہے دریادلی کے ساتھ

یہ حاصلِ حیات ہے، یہ فخرِ کائنات
اے زندگی مذاق نہ کر آدمی کے ساتھ

گِنوا رہے ہیں عیب ہمارے جنابِ شیخ
شعلوں سے چھیڑ، پیرہنِ کاغذی کے ساتھ

کچھ احتجاج کرتی ہیں رہ رہ کے دھڑکنیں
کیا دل کو اتفاق نہیں بے حسی کے ساتھ

پڑتا ہے زندگی کا اثر شعر پر حفیظؔ
کردار کی بھی فکر کرو شاعری کے ساتھ

★★

☆
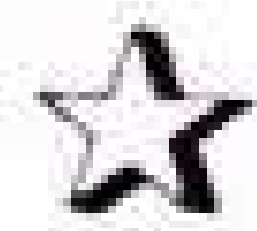
زندگی کیوں ہو گئی بارِ گراں کیسے کہیں
آپ ہی کی ہیں کرم فرمائیاں کیسے کہیں

لب ہلانا بھی ہے مشکل داستاں کیسے کہیں
بڑھ گئیں ہیں اس قدر پابندیاں کیسے کہیں

اور ہو جائے گا دشمن باغباں کیسے کہیں
کس نے پھونکا ہے ہمارا آشیاں کیسے کہیں

مدّعی سے مل گیا ہے ترجماں کیسے کہیں
غیر کے ہاتھوں میں ہے اپنی زباں کیسے کہیں

اہلِ گلشن اب ہمارے نام سے واقف نہیں
ہم نے رکھی ہے بنائے گلستاں کیسے کہیں

خود بخود الفاظ میں ڈھلتی گئی دل کی صدا
تیرے دیوانوں نے سوچا ہی کہاں کیسے کہیں

عیش کوشی اصل میں ہے مرگ سامانی کا نام
جان کے آزار کو آرامِ جاں کیسے کہیں

دل کے بل بوتے پہ کہہ ڈالی غزل ہم نے حفیظؔ
سوچتے ہی رہ گئے اہلِ زباں کیسے کہیں

★★

☆
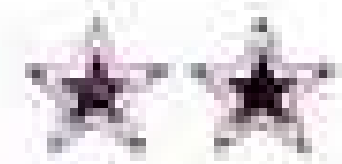
اے شیخِ حرم اب کوئی پیغامِ عمل دے
یہ لاکھ دعاؤں کی دعا میرے لئے ہے

ہر بُت کو جہاں بندہ نوازی کا ہے دعویٰ
مسموم وہاں آب و ہوا میرے لئے ہے

مظلوم تھا میں مجھ کو ہی ٹھہراتے ہیں مجرم
یہ فلسفہ جرم و سزا میرے لئے ہے

دنیا مجھے بے یار و مددگار نہ سمجھے
کوئی نہ سہی میرا خدا میرے لئے ہے

ڈر ہے کہیں پھر کفر کی جانب نہ پلٹ جاؤں
اب تک درِ بُت خانہ کُھلا میرے لئے ہے

ہو جاؤں گا اک روز یونہی نذرِ تغافل
تدبیر، نہ کوشش، نہ دعا میرے لئے ہے

میں حق کا سپاہی ہوں تماشائی نہیں ہوں
ہر معرکہ کرب و بلا میرے لئے ہے

★★

☆
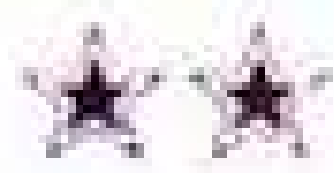
اسرار مجھ پہ کُھلنے لگے کائنات کے
طے کر رہا ہوں مرحلے عرفانِ ذات کے

تیور یہ کہہ رہے ہیں ترے التفات کے
لالے پڑیں گے اور سکونِ حیات کے

راہِ نجات پوچھیے ان رہبروں سے کیا
یہ لوگ تو غلام ہیں خود خواہشات کے

ہر آن سامنے ہو اگر مقصدِ حیات
صدیوں سے بھی دراز ہیں لمحے حیات کے

میں داستانِ درد ہوں تاریخِ کرب ہوں
سارے وجود پر ہیں نشاں حادثات کے

یہ خون ایک مردِ مجاہد کا خون ہے
پھوٹیں گے قطرے قطرے سے چشمے حیات کے

اتنی عجیب، ایسی حسیں، اس قدر عظیم
پیچھے ضرور ہے کوئی اِس کائنات کے

جس کو ہوس تھی عمرِ خضر کی وہ بد نصیب
نزدیک جا کے مر گئے آبِ حیات کے

کچھ اکتسابِ نور کریں ان سے اے حفیظ
مہماں مہ و نجوم ہیں بس رات رات کے

★★

☆
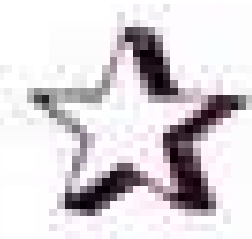
اگرچہ کوئی گرانی نہیں تھکن بھی نہیں
جو دل کی جان ہے دل میں وہ بانکپن بھی نہیں

گلے لگایئے بس آدمی سمجھ کے ہمیں
ہماری کوئی زباں بھی نہیں وطن بھی نہیں

انھیں بھی شوق ہُوا انجمن پہ چھانے کا
ابھی جو واقفِ آدابِ انجمن بھی نہیں

وطن پرست نہیں ہوں یہ اور بات مگر
خدا گواہ کہ میں دشمنِ وطن بھی نہیں

نہیں ہے جس کی نگاہوں میں وسعتِ کونین
مری نظر میں وہ شائستہ وطن بھی نہیں

کوئی زباں ہی نہ سمجھے تو کس سے بات کرے
حفیظ ویسے تو کچھ ایسا کم سخن بھی نہیں

★★

☆
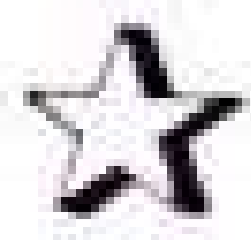
ہزار جہل مرکّب اور آگہی تنہا
جواب دے گی اندھیروں کو روشنی تنہا

بنے گا اپنے ہی سائے کی جان کا دشمن
اگر بچا کبھی دنیا میں آدمی تنہا

دعا کرو کہ نہ مر جائے آدمی کا ضمیر
بجھانے والے بہت اور روشنی تنہا

تکلّفات سے آسودگی نہیں ملتی
سکونِ دل کی ضمانت ہے سادگی تنہا

خدا کرے کہ شرافت کی لاج رہ جائے
عداوتوں کے مقابل ہے دوستی تنہا

★★

☆
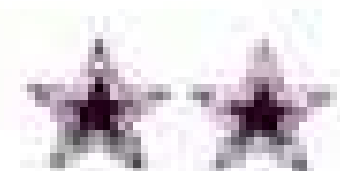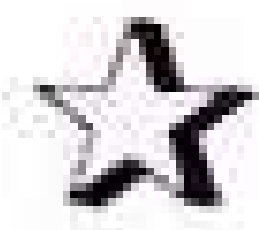
جانے کب مہرباں موسم ہو سماں کب بدلے
آؤ کچھ کر کے دکھائیں انھی حالات کے ساتھ

اب یہ دنیا کو اندھیروں کے سوا کیا دے گی
رات نے عہدِ وفا کر لیا ظلمات کے ساتھ

وصف جو کچھ ہے مری بات میں ہے مجھ میں نہیں
آپ ہرگز نہ ہوں وابستہ مری ذات کے ساتھ

ہار مانی ہی نہیں میں نے اندھیروں سے کبھی
آج تک برسرِ پیکار ہوں ظلمات کے ساتھ

کیسی الجھن میں پھنسایا مجھے تُو نے اے دل
خوفِ رسوائی بھی ہے شوقِ ملاقات کے ساتھ

★★

☆

پہلے تو آستینوں میں کچھ سانپ پالئے
بانہیں پھر آپ اپنی ہی گردن میں ڈالئے

ہر مرحلے پہ جان کو خطرے میں ڈالئے
یعنی حیات کا کوئی مصرف نکالئے

نقصانِ جان و مال پہ رونا فضول ہے
ہر غم کو انقلاب کے قالب میں ڈھالئے

کس مسخرے نے آپ کو قاتل بنا دیا
دامن سمیٹئے، کبھی خنجر سنبھالئے

اندھے ہوئے تھے ایسے مری دشمنی میں لوگ
شعلوں کو یوں ہوا دی کہ دامن جلا لئے

ظالم ہماری آن سے واقف نہیں ہے تُو
جھکنا نہیں قبول کیا، سر کٹا لئے

اس دور میں یہی تو ہے ہر مسئلے کا حل
ہر مسئلے کو اور بھی اُلجھن میں ڈالئے

دھندلا گئے ہیں نقشِ خلوصِ وفا حفیظؔ
اپنے لہو کے رنگ سے ان کو اُجالئے

★★

☆
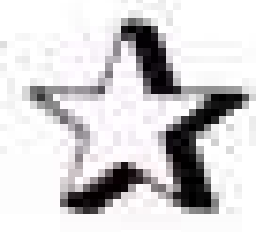
نظریں تو کر رہی تھیں نظاروں سے گفتگو
دامن نے بڑھ کے چھیڑ دی خاروں سے گفتگو

سب قہقہوں کے ساتھ ہیں سب چہچہوں کے ساتھ
کرتا ہے کون درد کے ماروں سے گفتگو

کٹنی ہے کٹ ہی جائے گی آخر شبِ فراق
ہو گی تمام رات ستاروں سے گفتگو

وہ لوگ جن کو جیب و گریباں عزیز ہیں
کس منہ سے کر سکیں گے سہاروں سے گفتگو

اب آپ مہربانی کی زحمت نہ کیجئے
ایسی ہی کچھ ہوئی ہے سہاروں سے گفتگو

ہٹ کر رہِ ستم سے کلیجے پہ رکھ کے ہاتھ
کوئی کرے تو سینہ فگاروں سے گفتگو

اک راہ اب یہی ہے کہ تیشہ اٹھایئے
ناکام ہو گئی ہے حصاروں سے گفتگو

دل میں اتر گئی ہے غزل کے، ادا حفیظؔ
کرتی ہے کیا لطیف اشاروں سے گفتگو

★★

☆
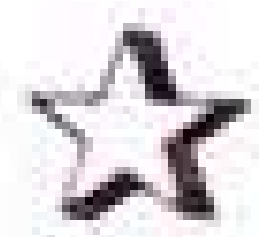
فرعونیت کی راہ پہ جس وقت آئے ہیں
لوگوں نے اپنے آپ کو سجدے کرائے ہیں

ایمان کی تو یہ ہے کہ عہدِ شباب میں
ہم نے بھی مہ رخوں کے بہت دل دکھائے ہیں

پہلے ہوس پرست تھے اب ہیں وفا پرست
ہم کتنی دور سے ترے نزدیک آئے ہیں

لگتا ہے باغبانوں نے پھولوں کے نام سے
اب رنگ و بو کے جال چمن میں بچھائے ہیں

کہہ تو دیا ہے آخری دم تک لڑیں گے ہم
اے انقلاب ہم پہ شہیدوں کے سائے ہیں

اب مال ہی عزیز نہ پیاری ہے جان ہی
ایمان لائے ہیں تو بس ایمان لائے ہیں

کھُلتے ہیں انکشاف کے در ان سے اے حفیظ
فطرت کے جو لطیف اشارے کنائے ہیں

☆☆

☆
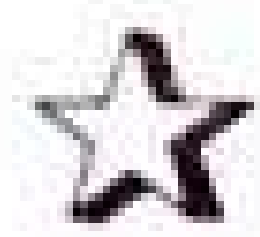
یہ کیا خبر تھی اجل کے سپرد کر دے گا
اُسے گماں تھا شفا اُس کو چارہ گر دے گا

یہ میرا ذوقِ نبرد آزمائی میرے لئے
کوئی عدو کوئی دشمن تلاش کر دے گا

اگرچہ مجھ پہ بہت مہربان ہے صیاد
بلندیوں پہ نظر کی تو پر کتر دے گا

وہ زندگی کی ضمانت تو دے رہا ہے مگر
مری شناخت کو قسطوں میں قتل کر دے گا

بشر کو ایسے مسائل ہیں آج کل درپیش
جو شب کو سوچنے بیٹھا تو صبح کر دے گا

جو کہہ رہا ہے قسم کھا کے "بے ضرر ہوں میں"
وہ ایک روز اچانک ہی وار کر دے گا

میں ڈر رہا ہوں بہت اس کی سادہ لوحی سے
مرے خلاف کوئی اس کے کان بھر دے گا

اب ایسا لگنے لگا ہے کہ جیسے کمپیوٹر
فلک کے سارے ستارے شمار کر دے گا

حفیظؔ مجھ کو فرشتہ کہے گی جب دنیا
مرا ضمیر مجھے سنگ سار کر دے گا

★★

☆
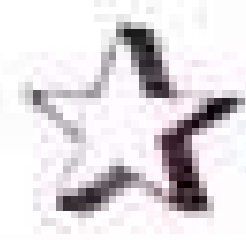
کیسی دیوار اور کیا کہسار
جذبہ شوق آ بروئے کار

تم سے کیسے نبھے مری سرکار
تم خوشامد پسند میں خوددار

علم و فن، عقل و ہوش سب بیکار
کچھ نہیں ہے اگر نہیں کردار

ہو گئی آپ کے زمانے میں
موت آسان زندگی دشوار

کون بیٹھے ہمارے سائے میں
ہم ہیں گرتی ہوئی سی اک دیوار

★★

☆
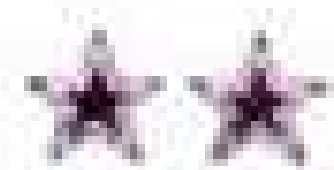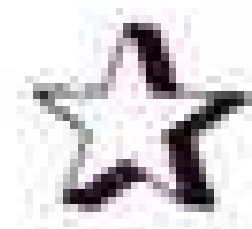
بے لوث محبّت کا حق اِس طرح ادا کر
امیدِ وفا رکھ نہ جفاؤں کا گلہ کر

اب عقل سے انسان پریشان بہت ہے
رکھ دے نہ کہیں عقل ہی دیوانہ بنا کر

اب ان سے بھی اظہارِ حقیقت نہیں ہوتا
چہرے بھی دغاباز ہیں چہرے نہ پڑھا کر

محسوس یہ کرتے ہی نہیں درد کسی کا
دولت جنھیں بخشی ہے انھیں دل بھی عطا کر

★★

☆
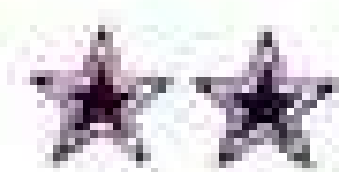
چاہتے ہیں کہ میں مر جاؤں قضا سے پہلے
میرے غمخوار جو دیتے تھے دلاسے پہلے

میں نے ہی توڑا ہے یہ سہما ہوا سناٹا
کوئی آواز نہ تھی میری نوا سے پہلے

خالی ہاتھ آگیا میں لوٹ کے الٹے پاؤں
اس نے احسان جتایا جو عطا سے پہلے

یہ نہ ہو اس پہ تکبّر کا گماں ہونے لگے
دیکھنا یہ بھی ہے اظہارِ انا سے پہلے

عقل نے کر دیا اربابِ خرد کو پاگل
منطقی پوچھتے ہیں کیا تھا خدا سے پہلے

بعد کی باتیں ہیں سب ناز و ادا، حسن و جمال
واسطہ مجھ کو پڑا اس کی حیا سے پہلے

تجربہ یہ بھی کریں آپ کسی روز حفیظؔ
اعتراف اپنے گناہوں کا دعا سے پہلے

★★

☆

رنگ پر اپنے غم جب آتا ہے
آدمی قہقہے لگاتا ہے

جب وفا پر نکھار آتا ہے
عشق سے حسن ہار جاتا ہے

شکر والو اِسی محبّت میں
صبر کا بھی مقام آتا ہے

مجھ کو غم ہے کہ تیری یادوں کا
سلسلہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے

اب کہاں تک سنبھالئے دل کو
جانے کیوں ڈوب ڈوب جاتا ہے

بے قراری کا اہتمام کرو
دل اِسی سے سکون پاتا ہے

حال کیا آدمی کا پوچھو ہو
ٹھوکریں زندگی کی کھاتا ہے

نہیں معلوم کون اور کہاں؟
کوئی جیسے مجھے بلاتا ہے

اور رسوا کرے گا عذرِ گناہ
داغ دھونے سے پھیل جاتا ہے

ساتھ جب چھوڑتی ہے خودداری
خودکشی کا مقام آتا ہے

ہم کبھی سرنگوں نہیں ہونگے
جی! ہمیں سر کٹانا آتا ہے

زندہ رہنا ہے جس کو وہ فنکار
فن کو خونِ جگر پلاتا ہے

دین سے بھی نہیں ہے دُور حفیظؔ
شاعری سے بھی رشتہ ناتہ ہے

★★

☆
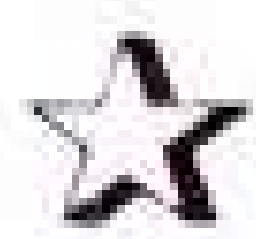
احباب سے کہدو ذرا دامن کو بچائیں
میں ڈوب رہا ہوں مرے نزدیک نہ آئیں

کیا اب بھی مرے درد کا درماں نہیں ہو گا؟
اللہ مرے حال پہ روتی ہیں دعائیں

ممکن نہیں دخل ان کی مشیّت میں کسی کا
مختار ہیں، مالک ہیں، بگاڑیں کہ بنائیں

آنا ہی تھا آ ہی گیا یہ مرحلہ آخر
پروا، نہ کریں جان کی، ایمان بچائیں

اس دور کے عیسیٰ تو یہی سوچ رہے ہیں
ہر زخم کو کس طرح سے ناسور بنائیں

اے چارہ گر اعجاز دکھا چارہ گری کا
جو روتے ہوئے آتے ہیں ہنستے ہوئے جائیں

مشکل تو ہے یہ کام، مگر کام یہی ہے
اس دور کے انسان کو انسان بنائیں

اچھی ہے یہی سوچ حفیظؔ اپنی نظر میں
دنیا سے ڈریں اور نہ دنیا کو ڈرائیں

★★

☆
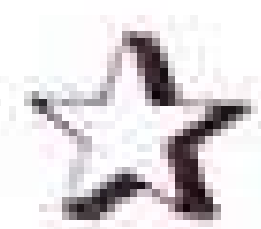
آپ جو سزا بھی دیں ٹھیک ہے مناسب ہے
ہاں میں ایک باغی ہوں میرا قتل واجب ہے

شاعروں سے مت پوچھو رہنماؤں سے پوچھو
رنگ کیوں سیاست کا شاعری پہ غالب ہے

باوقار رہنے کو برقرار رہنے کو
جنگ بھی ضروری ہے صلح بھی مناسب ہے

لاکھ علم والا ہو، لاکھ فضل والا ہو
معتبر نہیں ہے وہ شہ کا جو مصاحب ہے

میری ہی کمی ہے جو اس کو میرے رشتے کا
اعتراف ہے لیکن احترام غائب ہے

کوستے ہیں بیچارے گردشِ زمانہ کو
طرحدار لوگوں کو بس غمِ مراتب ہے

بھول کو بزرگوں کی بھول ہی کہا جائے
ساتھ ہی مگر ان کا احترام واجب ہے

سچ ہے اونچا سنتی ہیں اے حفیظؔ سرکاریں
کچھ خبر نہیں ان کو جن سے تُو مخاطب ہے

☆☆

☆
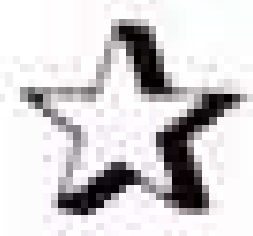
عمر یونہی گزر نہ جائے کہیں
رائگاں یہ سفر نہ جائے کہیں

پھینک دیجے اتار کر خود ہی
تاج کے ساتھ سر نہ جائے کہیں

وار موذی پہ ہو تو کاری ہو
چوٹ کھا کر پھر نہ جائے کہیں

پہلے بے چارے پر ستم توڑا
اب یہ ڈر ہے کہ مر نہ جائے کہیں

کس نے گل کر دئے گلوں کے چراغ
شک ترے حسن پر نہ جائے کہیں

دل کو ہم مان لیں سعادت مند
بے اجازت اگر نہ جائے کہیں

ایک چہرے پہ ان گنت چہرے
اعتبارِ نظر نہ جائے کہیں

میرے دشمن کے وار کو روکو
مجھ پہ احسان کر نہ جائے کہیں

کاروباری مشاعروں میں حفیظؔ
آبروئے ہنر نہ جائے کہیں

☆☆

☆
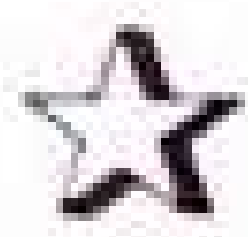
خوف سے جب سناٹا ہوگا
میری زباں پر نعرہ ہوگا

آخر تو تو میں میں ہوگی
رخصت جب اک سایہ ہوگا
ق
آج تو یہ گھر ہم سب کا ہے
کل یہ تیرا میرا ہوگا

کیوں سنتے ہو چیخ کسی کی
ہوگا کوئی دکھیارا ہوگا

ایسا کچھ لگتا تو نہیں ہے
کیا یہ سچ ہے سویرا ہوگا

کوئی کاری ضرب لگائے
یوں یہ دَور نہ سیدھا ہو گا

اس کی دنیا اللہ اکبر
جانے وہ خود کیسا ہو گا

کس کو یقیں آئے گا یارو
غالب بے استادا ہو گا

اپنے تو پھر اپنے ٹھہرے
غیر کو بھی اپنانا ہو گا

یہ دنیا جنت نہ بنے گی
جب تک دل نہ کشادہ ہو گا

چارہ گر تو قاتل نکلا
ہم سمجھے تھے مسیحا ہو گا

کھویا کھویا سا رہتا ہے
تم نے حفیظ کو دیکھا ہو گا

★★

☆

جب بھی آواز کوئی شعلہ نوا دیتا ہے
آگ ہر برف کے پیکر میں لگا دیتا ہے

چاکِ دامانِ سکوں اور بڑھا دیتا ہے
جانے تسکین کے پردے میں وہ کیا دیتا ہے

تشنگی میں تو کبھی بات نہ پوچھی اُس نے
اب سمندر بھی وہ دیتا ہے تو کیا دیتا ہے

انقلاب ایک نیا آ تو گیا ہے لیکن
دیکھنا ہے کہ یہ تاریخ کو کیا دیتا ہے

قوم کو بیچ دیں جو دولت و منصب کے لئے
اُن کا کردار ہی خود اُن کو سزا دیتا ہے

کیا دیا آپ نے بھوکوں کو فریبوں کے سوا
میرا کردار صلیبوں کو غذا دیتا ہے

مجھ سے کہتا ہے کہ اس سے تری شہرت ہو گی
میرا ناقد مرے عیبوں کو ہوا دیتا ہے

ایسے اندیشۂ انجام کو کیا کہئے حفیظؔ
چاہتا ہوں کبھی ہنسنا تو رُلا دیتا ہے

★★

☆
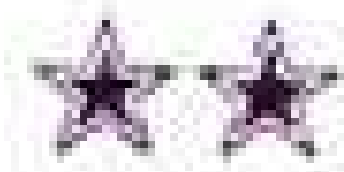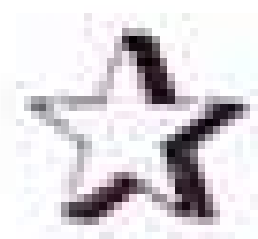
حریمِ حسن کی دربانیوں کا کیا کہنا
میں سنگِ در پہ تھا اور باریاب جیسا تھا

شریکِ بزم تھا لیکن نظر جھکائے ہوئے
وہ بے حجاب نہ تھا بے حجاب جیسا تھا

میں بات سنتا رہا روح رقص کرتی رہی
کہ ہُو بہو کوئی لہجہ رباب جیسا تھا

کسی نے اس سے کبھی حرفِ بزمی نہ سنا
بس اک سکوت ہی اس کا عتاب جیسا تھا

وہ خود بڑا تھا مگر دل بڑا نہ تھا اس کا
مجھے ملا جو سمندر سراب جیسا تھا

گزار کر تو دکھائے مری طرح کوئی
ترس رہا تھا مگر فیضیاب جیسا تھا

پسند کس کی تھی اظہار کس کے منھ سے ہوا
یہ انتخاب نہ تھا انتخاب جیسا تھا

ہمارے آگے نہ کیجے حفیظؔ کی تعریف
ہمیں خبر ہے وہ خانہ خراب' جیسا تھا

★★

☆
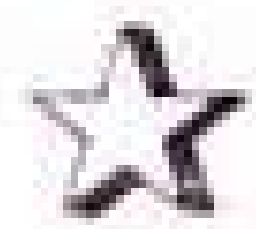
زمانے کی زد سے بچاؤ تو جانیں
سلامت رہے رکھ رکھاؤ تو جانیں

یہ گوشہ نشینی تو اک بُزدلی ہے
نظر زندگی سے ملاؤ تو جانیں

علاقہ ہے یہ حضرتِ محتسب کا
یہاں بھی اگر لڑکھڑاؤ تو جانیں

ہمارے لئے جو فلک بن نہ جائے
زمیں کوئی ایسی بتاؤ تو جانیں

غریبوں کا خوں جن کے منہ لگ گیا ہے
اگر ان سے توبہ کراؤ تو جانیں

جو پوچھا کہ کیا ہے وفا؟ ہنس کے بولے
بتاؤ تو جانیں، دکھاؤ تو جانیں

حفیظؔ آج انسانیت مر رہی ہے
کسی طرح اس کو بچاؤ تو جانیں

★★

☆

نورِ یقیں سے خالی رہ کر گمراہی پھیلائے گا
دل کا کوئی دین نہ مذہب دل کیا راہ دکھائے گا

کیوں مظلوم کے آنسو پوچھیں صبر کی کیوں تلقین کریں
بے چارہ کب تک روئے گا آخر چپ ہو جائے گا

ہم بھی تو کچھ سوچیں یارو مستقبل کے بارے میں
یہ تو کوئی سوچ نہیں "جو ہونا ہے ہو جائے گا"

منہ نہ لگائے گا اب مجھ کو یہ دعویٰ ہے اس کا حفیظؔ
لیکن میرا دل کہتا ہے وہ خود ہاتھ بڑھائے گا

★★

☆
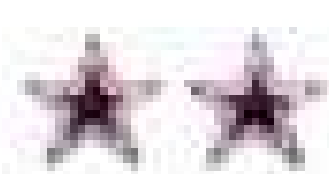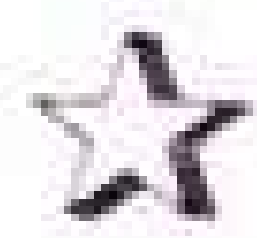
کبھی قفس سا کبھی آشیاں سا لگتا ہے
یہ میرا گھر مجھے ہندوستاں سا لگتا ہے

اِس اجنبی سے سوالِ کرم کروں نہ کروں
یہ دیکھنے میں تو کچھ مہرباں سا لگتا ہے

کبھی یہ ٹھوس حقیقت کی شکل میں ہوگا
ہمارا خواب ابھی تو دُھواں سا لگتا ہے

میں اُس کو دیکھ کے گھبرا رہا ہوں محفل میں
وہ آدمی جو مرا رازداں سا لگتا ہے

یہ جانتا ہوں کہ فانی ہوں پھر بھی جانے کیوں
مرا وجود مجھے جاوداں سا لگتا ہے

یہ کیا مقام ہے یارو کہ آج ہر انعام
خدا گواہ مجھے امتحاں سا لگتا ہے

ہوس نہیں ہے تو سب کچھ ہے میرے پاس حفیظؔ
غریب خانہ بھی جنت نشاں سا لگتا ہے

★★

☆

راہ روکیں گے دشت و دریا کیا
عزم کے سامنے ہمالا کیا

اس کی توفیق ہی سے ہے سب کچھ
ورنہ میں کیا مرا ارادہ کیا

بوند بھر میں نہال ہو جاؤں
وہ نوازیں تو کم زیادہ کیا

آدمی کو کہیں قرار نہیں
بڑھ گئی حد سے حُبِ دنیا کیا

ہر بُنِ مو بنا ہے شکر و سپاس
اس سے بڑھ کر کوئی وظیفہ کیا

جب یہ طے ہے کہ بے مثال ہے وہ
پھر یہ تشبیہ و استعارہ کیا

کُن کہا اور بن گئی دنیا
اس کہانی کی روپ ریکھا کیا

میرے پیچھے پڑی ہے کیوں دنیا
مجھ کو دنیا سے لینا دینا کیا

سب مری داستاں کے ٹکڑے ہیں
لُوٹ کیا، خون کیا، خرابہ کیا

آج دونوں میں کوئی فرق نہیں
منظر قتل کیا تماشہ کیا

عقل حیران ہے پریشاں ہے
ہو گیا زندگی کا نقشہ کیا

ہم خیالی نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہم نوالہ و ہم پیالہ کیا

یہ نیا عالمی نظام حفیظؔ
کیا سمجھتے تھے اور نکلا کیا

★★

☆
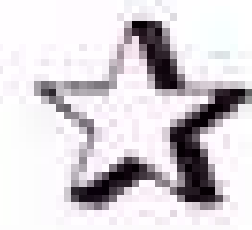
آئے ہی جاتے ہیں لے کر جانوں کے نذرانے اور
مر جانے سے کم نہیں ہوتے بڑھتے ہیں پروانے اور

ایک طرف سرکار مذمت کرتی ہے مے نوشی کی
ایک طرف کھلتے جاتے ہیں سرکاری مے خانے اور

قوم پرستی نام رکھا ہے قومی بے ایمانی کا
لینے کے پیمانے اور ہیں دینے کے پیمانے اور

اب تو یہ ٹھانی ہے ہم نے ظالم کو للکاریں گے
خاموشی سے ظلم سہے تو ظلم کیے دنیا نے اور

ہمدردی سے، غمخواری سے جس کا دامن خالی ہو
سیم و زر کی اس دنیا پر اک ٹھوکر دیوانے اور

میری وفاداری کا، میری خدمت کا، قربانی کا
کیا دیتی انعام مجھے الزام دئے دنیا نے اور

قادرِ مطلق کو بھولے ہیں، علم و ہنر پر پھولے ہیں
جیسے جیسے عقل بڑھے گی بہکیں گے فرزانے اور

اندیشوں کی الجھن میں پڑتے ہی نہیں اربابِ وفا
سیدھی سچی راہ یقیں کی وہم کے تانے بانے اور

مجھ کو ہنسنے گانے والا کہتے ہیں سب لوگ حفیظؔ
کوئی میرے اندر جھانکے کوئی مجھے پہچانے اور

★★

☆

ہر ایک چیز ہے مظہر تری خدائی کی
مرے خدا! کوئی حد بھی ہے خود نمائی کی

دوا سے پہلے شِفا کا سُرور آئے گا
ذرا ہوا تو چلے درد آشنائی کی

ہوس کے رحم و کرم پر خدا نے چھوڑ دیا
جب آدمی نے محبّت سے بے وفائی کی

سبھی سے ٹوٹ کے ملنے کو چاہتا ہے دل
قریب آگئی شاید گھڑی جدائی کی

سوال کے وہ کبھی منتظر نہیں ہوتے
زباں سمجھتے ہیں جو لوگ بے نوائی کی

کسی رئیس کے در پر بھی جا کے کیا ہو گا
صلاحیت ہی نہیں ہم میں جب گدائی کی

یہی مقام ہے اے دوست خود شناسی کا
ہنسی اڑانے لگے لوگ خود ستائی کی

کرم سے ہاتھ جو اہلِ کرم نے کھینچ لیا
ہمارے ساتھ بُرائی نہیں بھلائی کی

نہیں تو کون یہاں سُن رہا تھا میری بات
جنوں سے مصلحتاً میں نے آشنائی کی

حفیظؔ آپ کی خاطر ہوا ہے یہ اعلان
کہ میکدے میں اجازت ہے پارسائی کی

★★

☆
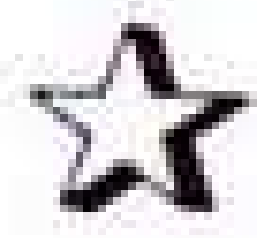
ناز اہلِ کرم اٹھائیں کیا
باربار ان کے در پہ جائیں کیا

چوٹ کھانے سے ہچکچائیں کیا
کچھ نہ کھوئیں اگر تو پائیں کیا

مقتلوں کو نوازنے والے
محفلوں میں غزل سنائیں کیا

خوں رلاتی ہے تیری یاد جمیل*
شعر کے پھول مسکرائیں کیا

کوئی پکڑے ہے دل جگر کوئی
چل پڑیں درد کی ہوائیں کیا

* جمیل میرٹھی مرحوم

ملتوی ہو گئی شکستِ جام
مشورہ دے گئیں گھٹائیں کیا

اب وہ شرمندہ ہیں جفاؤں پر
کام کرنے لگیں وفائیں کیا

ہم بہت تھک گئے ہیں اے دیوار
تیرے سائے میں بیٹھ جائیں کیا

ذکرِ نرگس کیا تھا ہم نے ہی
تیری آنکھوں کو منہ دکھائیں کیا

تختۂ دار تک تو آ پہنچے
اور آگے قدم بڑھائیں کیا

دیجیے جان ہنستے ہنستے حفیظؔ
دشمنِ جاں سے التجائیں کیا

★★

☆
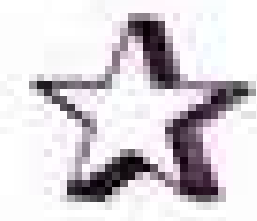
دیش کا نیتا ووٹ کی بھکشا بھاشن دیکر مانگے ہے
یعنی ہمارے قتل کو ظالم ہم سے ہی خنجر مانگے ہے

اُس کو پکڑو اُس کو مارو جس نے جگایا ہے اس کو
یہ فٹ پاتھ پہ سونے والا رہنے کو گھر مانگے ہے

پہلے تو برباد کرے ہے بم برسا کر شہروں کو
تعمیروں کے ٹھیکے بھی پھر حملہ آور مانگے ہے

ہارا ہوں تو دوست بھی میرے دشمن ہوتے جاتے ہیں
اب میری تلوار ہی مجھ سے خود میرا سر مانگے ہے

مجبوری اور پیشہ وری کی یہ زندہ تصویریں ہیں
اک چپ ہے دامن پھیلائے اک چلا کر مانگے ہے

کنجوسی موذی کی فطرت اور ہوس شیوہ اُس کا
مشکل سے اک قطرہ دے ہے اور سمندر مانگے ہے

اپنے اپنے ڈھنگ سے شاعر داد طلب کرتے ہیں حفیظ
کوئی ڈرامہ بازی کر کے کوئی گا کر مانگے ہے

★★

☆
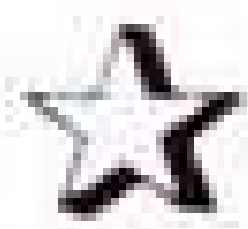
محشر میں کانپتے ہیں ستمگر الگ الگ
جانا ہے پیشِ داورِ محشر الگ الگ

جب رات ہو گئی تو فلک پر بچھا لئے
تاروں نے اپنے نور کے بستر الگ الگ

بھاشن فساد کے کبھی تقریر امن کی
جادوگروں کو یاد ہیں منتر الگ الگ

یکجا نہ ہو سکیں گے یہ رہبر بڑے بڑے
ہیں خاص مچھلیوں کے سمندر الگ الگ

شاید انا پسند بہت ہیں یہاں کے رِند
اس میکدے میں سب کے ہیں ساغر الگ الگ

یلغار ایک ہو کے مجھی پر کریں گے سب
خیمے الگ الگ سہی لشکر الگ الگ

اِس بد نصیب شہر میں چلتے ہیں آدمی
اَک دوسرے کے سائے سے بچ کر الگ الگ

مل بیٹھنے کی بات کریں کیسے اے حفیظؔ
ناراض دوستوں کے ہیں تیور الگ الگ

★★

☆
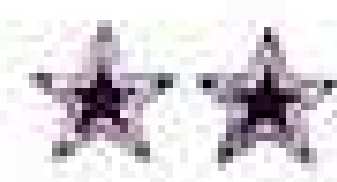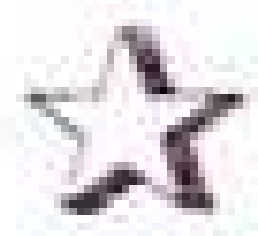
کیا بُرا وقت ہے مفلسوں کے لئے
خون بیچا گیا روٹیوں کے لئے

میرا غم خوار مجھ سے یہ کہنے لگا
میرا دامن نہیں آنسوؤں کے لئے

آج مردم شناسوں کو کیا ہو گیا
لوگ جھکتے ہیں بہروپیوں کے لئے

لے کے نامِ خدا جان پر کھیل جا
بزدلوں میں نہ جا مشوروں کے لئے

پگڑیوں کی ہمیں اب ضرورت نہیں
ہم کفن چاہتے ہیں سروں کے لئے

گنگناتا چلا جاؤں گا دار پر
میری غزلیں نہیں محفلوں کے لئے

محفلوں کے لئے تو بہت ہیں مگر
شمعیں ملتی نہیں اب گھروں کے لئے

ایک بنتِ حیا کو یہ کہنا پڑا
میں نہیں ہوں تماشائیوں کے لئے

اے خدا کیا یہی حکم ہے اب ترا
مسجدیں چھوڑ دیں ہم بتوں کے لئے

خیر خواہی کے جذبات رکھے حفیظؔ
دوستوں کے لئے دشمنوں کے لئے

★★

☆
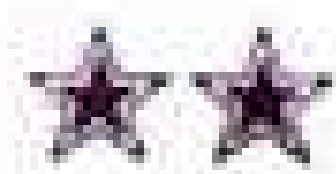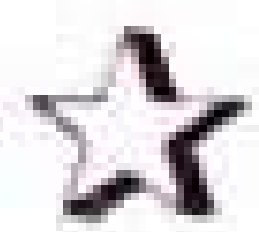
جتنی شمعیں تھیں سب بجھ گئیں
روشنی دے چراغِ یقیں

بارہا گفتگوئیں ہوئیں
مسئلہ ہے وہیں کا وہیں

تم جوابِ وفا دو نہ دو
اِس سے کچھ فرق پڑتا نہیں

راہ زن سوچ میں پڑ گئے
میں نے لُٹ کر دعائیں جو دیں

تیرے دامن سے نادم ہوں میں
میری آنکھوں میں آنسو نہیں

جب سہاروں نے طعنے دیے
ہم نے بیساکھیاں پھینک دیں

تجربوں سے بھی کچھ سیکھتے
آپ نے بس کتابیں پڑھیں

جب کہا میں نے میں بھی ہوں کچھ
خامیاں مجھ پہ ہنسنے لگیں

میں نے واللہ میرے وطن
تجھ کو چاہا ہے پوجا نہیں

☆☆

☆
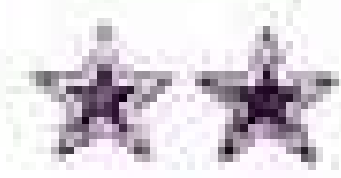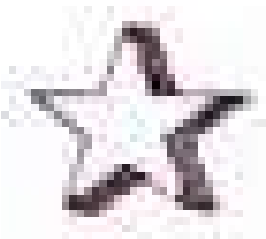
پی کر چین اگر آیا بھی کتنی دیر کو آئے گا
نشّہ اک آوارہ پنچھی چہکے گا اڑ جائے گا

منظر کی تکمیل نہ ہوگی تنہا مجھ سے فنکارو!
دکھ کے گیت تو میں گا دونگا آنسو کون بہائے گا

ایک سخی کو اپنا سمجھ کر عرضِ حال کی ٹھانی ہے
بیری دل کہتا ہے پگلے کاسہ بھی چھن جائے گا

میرا سمندر پار سفر پر جانا ایک قیامت ہے
جیسے ہر چہرے پہ لکھا ہو میرے لئے کیا لائے گا

جاتے جاتے پوچھ رہا ہے امن کے رکھوالوں سے حفیظؔ
کیوں جی کیا ہم لوگوں سے میرٹھ خالی ہو جائے گا

★★

☆

دل میں بسا تھا میرے جو دار و رسن کا حسن
الجھا سکا نہ زلفِ شکن در شکن کا حسن

آلودگی نے چھین لی پانی کی آب و تاب
صنعت کی نذر ہو گیا گنگ و جمن کا حسن

خودغرضیوں کی آگ یہاں تک پہنچ گئی
اہلِ وطن کی زد پہ ہے اب خود وطن کا حسن

نا اہلیوں کے داغ لئے ہے روِش روِش
مالی نے خود تباہ کیا ہے چمن کا حسن

تجھ سے تو کچھ غرض نہیں، ہاں دیکھتے ہیں ہم
کوچے میں تیرے بیٹھ کے اپنی تھکن کا حسن

تاثیر ناپ تول سے آگے کی بات ہے
پیمائشیں بتا نہ سکیں گی سخن کا حسن

احسان درد و غم کا، مرے فکر و فن پہ ہے
نکھرا ہے درد و غم سے مرے فکر و فن کا حسن

سوز و گداز کی بھی ضرورت ہے اے حفیظؔ
کچھ رنگ و نور ہی سے نہیں انجمن کا حسن

★★

☆
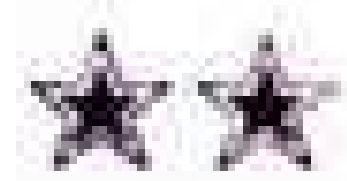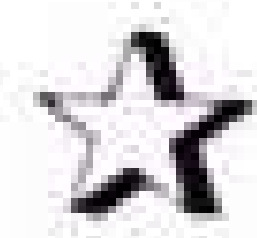
دشمن کو کیوں کہوں کہ مرے قاتلوں میں تھا
خود میرا ہاتھ ہی مری بربادیوں میں تھا

تیرا گماں ہوا نہ کسی اور پر کبھی
آہنگ ایک خاص تری دستکوں میں تھا

جب بحث چھڑ گئی تو وہ خاموش ہو گیا
اس کا تمام علم تو الماریوں میں تھا

بے رحم حادثے نے اسے کیا بنا دیا
اُس شخص کا شمار تو لالہ رخوں میں تھا

جذبہ طلب کا کم نہ کسی دور میں ہوا
جو عسرتوں میں تھا وہی خوشحالیوں میں تھا

پھر سطح پر ٹھہرتے بھی کیوں اہلِ جستجو
جب گوہرِ مراد ہی گہرائیوں میں تھا

دیکھا ہے ہم نے جشن بھی شہرت مآب کا
بے زاریوں کا رنگ پذیرائیوں میں تھا

یوں بھی سنور گئی ہے غزل خود بخود کبھی
کچھ حسن تھا ردیف میں کچھ قافیوں میں تھا

روتے ہیں اہلِ فکر و نظر کیوں حفیظؔ کو
دانش وروں میں تھا نہ وہ نکتہ رسوں میں تھا

★★

☆
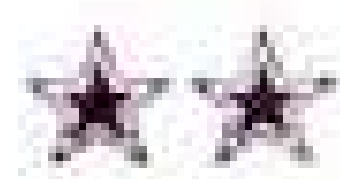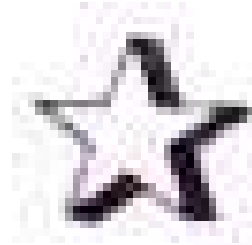
عجیب لوگ ہیں کیا خوب منصفی کی ہے
ہمارے قتل کو کہتے ہیں خودکُشی کی ہے

یہ بانکپن ہے ہمارا کہ ظلم پر ہم نے
بجائے نالہ و فریاد شاعری کی ہے

ذرا سے پاؤں بھگوئے تھے جا کے دریا پر
غرور یہ ہے کہ ہم نے شناوری کی ہے

کہیں چمن میں نئی پود کو جگہ نہ ملے
یہ سوچ اصل میں احساسِ کمتری کی ہے

اُسی لہو میں تمھارا سفینہ ڈوبے گا
یہ قتلِ عام نہیں تم نے خودکشی کی ہے

ہماری قدر کرو چودھویں کے چاند ہیں ہم
خود اپنے داغ دکھانے کو روشنی کی ہے

اداسیوں کو حفیظؔ آپ اپنے گھر رکھیں
کہ انجمن کو ضرورت شگفتگی کی ہے

★★

☆
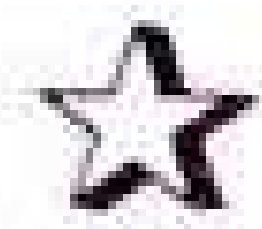
نکتہ چیں اچھا لگا ہے طعنہ زن اچھا لگا
وہ نرالا بت ہوں جس کو بت شکن اچھا لگا

کروفر کی زندگی پر موت کو ترجیح دی
مجھ کو درباری قباؤں سے کفن اچھا لگا

شاعری اک درد بھی ہے درد کا پیغام بھی
یہ تڑپنے اور تڑپانے کا فن اچھا لگا

اپنی تعریفوں کے پل باندھے ہیں جس فنکار نے
شخصیت اچھی لگی اس کی نہ فن اچھا لگا

پیرہن کی میں نے جب تعریف کی، کہنے لگے
ہم تمہیں اچھے لگے یا پیرہن اچھا لگا

زندہ رہیے دوسروں کو زندہ رہنے دیجیے
اے حفیظ اس طرح جینے کا چلن اچھا لگا

★★

☆
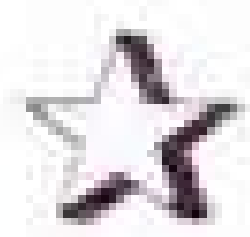
پھر رہے ہیں خود نمائی کو وہ بے پردہ کیے
اِس ہوس نے کیسے کیسے خوبرو رسوا کیے

ہم ضرورت اور انا کی کشمکش دیکھا کیے
بھیک ٹھکرایا کیے دامن بھی پھیلایا کیے

دیکھنے دیتے نہیں کچھ سوچنے دیتے نہیں
وہ جو بیٹھے ہیں نگاہ و فکر پر قبضہ کیے

بزدلوں میں ڈھونڈتے ہو کیوں حمیّت کا جلال
مدّتیں گزریں اِنھیں اِس آگ کو ٹھنڈا کیے

یہ نہ سننا، یہ نہ پڑھنا، یہ نہ مل جانا کہیں
شوق کے دروازے اِن پابندیوں نے وا کیے

وار کو ان کے کبھی خاطر میں لایا ہی نہیں
کتنے دشمن میں نے اِس تدبیر سے پسپا کیے

چاند کا کردار اپنایا ہے ہم نے دوستو!
داغ اپنے پاس رکھے روشنی بانٹا کیے

رشک مجھ کو بے ضمیروں پر نہیں آیا حفیظؔ
لاکھ میرے حال پر وہ طنز فرمایا کیے

☆☆

☆
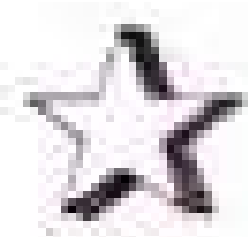
بے حس دنیا کو حیرت ہے میری بے چینی پر کیوں
اب یہ کون بتائے سانسیں بن جاتی ہیں نشتر کیوں

وہ بھی ہم کو بھول چکے ہیں ہم بھی اُن کو بھول چکے
یادیں دستک دیتی ہیں پھر دل کے دروازے پر کیوں

میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کھیل کھیل ہو جاؤں گا
پچھتاتے ہو پیارے میرے پیار کو اب ٹھکرا کر کیوں

جیسا کچھ برباد کیا ہے تم نے تم تو جانو ہو
اہل ستم پھر حال ہمارا پوچھو ہو چھندرا کر کیوں

فرض بلاتا ہو تو کیسی راحت اور کس کا آرام
میدانوں کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں بستر کیوں

جتنے ''حق گفتار'' تھے کب کے حق کی خاطر قتل ہوئے
اے غیرت موجود ہے اب تک دوش پہ یہ میرا سر کیوں

صابر شاکر تو ہوں لیکن یہ بھی کہہ اٹھتا ہوں کبھی
کب تک پاؤں سمیٹے رکھوں بڑھ نہیں جاتی چادر کیوں

وہ تو میرا ماضی تھا اور یہ ہے میرا حال حفیظؔ
ایسے دلکش پس منظر کا اتنا بھیانک منظر کیوں

☆☆

☆

جو بہت پاک بہت صاف نظر آتے ہیں
دام لگ جائیں جو بھرپور تو بک جاتے ہیں

سب اسیروں کو گنہگار نہ سمجھو یارو
قید خانے میں تو یوسف بھی پہنچ جاتے ہیں

جذبہ شوق کو وہ کم نہیں ہونے دیتے
نظر آتے ہیں کبھی اور کبھی چھپ جاتے ہیں

تم سے ہم ہاتھ ملائیں تو ملائیں کیسے
چوٹ پہنچی ہے جو تم سے اسے سہلاتے ہیں

جان لیوا ہے بہت مرحلہ حق گوئی کا
اس گزر گاہ میں آواز پہ تیر آتے ہیں

بحث کے موڈ میں ہوتے ہیں اگر دانشور
سلجھے سلجھائے مسائل کو بھی الجھاتے ہیں

فکر و فن سے نہیں اسٹیج کے شاعر کی شناخت
اب یہ معیار ہے کیا لیتے ہیں کیا پاتے ہیں

ظلم کی اپنے تلافی وہ نہیں کرتے حفیظؔ
صرف ہمدردی کا اظہار کئے جاتے ہیں

★★

☆
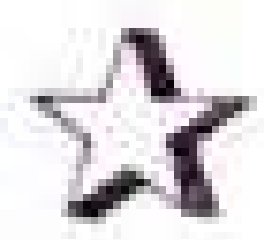
ترے غم نے تپا کر رکھ دیا ہے
مجھے کندن بنا کر رکھ دیا ہے

یہاں آیا نہیں بھونچال کوئی
دھماکوں نے ہلا کر رکھ دیا ہے

مرے قاتل کی فنکاری تو دیکھو
مرا لاشہ سجا کر رکھ دیا ہے

بُرا ان کو کہا میں نے نہ اچھا
بس آئینہ دکھا کر رکھ دیا ہے

کہا جب پیار سے ان کو مسیحا
تو خنجر مسکرا کر رکھ دیا ہے

جلن اب تو زمانے کو نہ ہو گی
خوشی میں غم مِلا کر رکھ دیا ہے

ستم یاد آئے سب ایک ایک کر کے
خزانہ گِن گِنا کر رکھ دیا ہے

سلامت ہے مری توبہ ابھی تک
ابھی ساغر اٹھا کر رکھ دیا ہے

ہمارے عہد کے دانشوروں نے
ہمیں پاگل بنا کر رکھ دیا ہے

حفیظؔ اب مجھ سے وہ سہمے ہوئے ہیں
جو کہتے تھے مِٹا کر رکھ دیا ہے

★★

☆

تمام رات آنسوؤں سے غم اُجالتا رہا
میں غم اجال اجال کر خوشی میں ڈھالتا رہا

جوان میری ہمتیں، بلند میرے حوصلے
حصار توڑتا رہا، کمند ڈالتا رہا

بہت ہی تلخ تجربہ تمھاری بزم میں ہوا
ہر آدمی مری انا کے بَل نکالتا رہا

ہیں التوا کی گود کے پلے سب اُس کے مسئلے
کسی کو حل نہیں کیا ہمیشہ ٹالتا رہا

ترے خلاف اس لئے مری زباں نہ کھل سکی
میں اپنی خامیوں پہ بھی نگاہ ڈالتا رہا

حفیظؔ کیا سناؤں اپنی خواہشوں کی داستاں
پلا پلا کے دودھ کتنے سانپ پالتا رہا

★★

☆
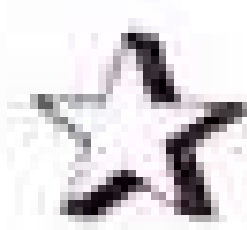
توبہ توبہ الٰہی یہ کیا کہہ دیا
میں نے گھبرا کے بُت کو خدا کہہ دیا

تیری وعدہ خلافی جو حد سے بڑھی
ہم نے جھوٹا تجھے برملا کہہ دیا

راہزن نے کہا مجھ کو گالی نہ دو
جب کسی نے اسے رہنما کہہ دیا

ان مکانوں کے سارے مکیں کیا ہوئے
اک اُداسی نے سب ماجرا کہہ دیا

آج خودداریوں کا بھرم بھی گیا
مہرباں سے جو کہنا نہ تھا کہہ دیا

مل گئی دولتِ دو جہاں مل گئی
آج اُس نے مجھے باوفا کہہ دیا

اس قدر مجھ سے برہم وہ کیوں ہو گئے
آخر ایسا انھیں میں نے کیا کہہ دیا

جب غرض باؤلی ہو تو کیا کیجئے
ایک جلّاد کو دیوتا کہہ دیا

ان کی محفل میں جا تو رہے ہو حفیظؔ
گر کسی نے کچھ اچھا بُرا کہہ دیا

☆☆

☆

زندگی آج اس کے سوا کچھ نہیں
لوٹئے، مارئے، ناچئے، گایئے

آسمانی ہدایت سے منہ موڑ کر
اب کہاں تک فریبِ خرد کھایئے

ہاں نہیں ہے خدا کے برابر کوئی
آپ ہم سے وطن کو نہ پجوایئے

مومنو بس خدا کی رضا کیلئے
سب سے ٹکرایئے، سب کو اپنایئے

★★

☆
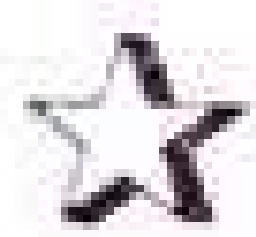
نہیں میں یہ نہیں کہتا نگر نہ راس آئے
وہیں کے ہو رہو تم اِس قدر نہ راس آئے

خلا نے کھول دیے مجھ پہ اپنے دروازے
مرے مزاج کو جب بحر و بر نہ راس آئے

یہ اک عجیب دعا ہے قبول ہو یا رب
ملے وہ شوقِ شہادت سپر نہ راس آئے

میں تجھ کو بھول گیا محوِ شاعری ہو کر
خدا کرے کہ تجھے یہ ہنر نہ راس آئے

رہوں تو کیسے رہوں جاؤں تو کہاں جاؤں
مرے خدا جو مجھے میرا گھر نہ راس آئے

میں زندگی کی رفاقت کی بات کرتا ہوں
سفر سفر ہے اگر ہم سفر نہ راس آئے

نہ جانے کس لئے راہِ وفا کو چھوڑ دیا
وہ راس آنے لگے تھے مگر نہ راس آئے

تمھاری بزم کا معیار ہم نے دیکھ لیا
تمھاری بزم کو اہلِ نظر نہ راس آئے

یہ بددعا کہیں ابلیس نے نہ دی ہو حفیظؔ
خدا کرے تجھے دنیا بشر نہ راس آئے

★★

☆
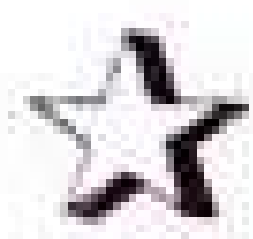
عہدِ وفا کو دار و رسن تک نبھا دیا
ہم نے جو کہہ دیا تھا وہ کر کے دکھا دیا

یہ حوصلہ دیا مجھے یا معجزہ دیا
ہر حادثہ کو میں نے کھلونا بنا دیا

تیرا بھی قرض اے غمِ جاناں چکا دیا
آنکھوں نے آنسوؤں کا خزانہ لٹا دیا

ہر دور کے تھے اپنے تقاضے جدا جدا
ہر موڑ پر سفر نے نیا رہنما دیا

یہ فیصلہ ہُوا کہ جزیرہ اُسی کا ہے
خود جس نے واپسی کا سفینہ جلا دیا

اپنا لباس لائقِ محفل نہ تھا مگر
بزمِ سخن کو ہم نے غزل سے سجا دیا

صیاد کی گرفت میں اب ہر پرند ہے
سازش کا جال سارے چمن میں بچھا دیا

میں اک نشانِ راہ تھا پتھر نہ تھا حفیظؔ
دنیا نے راستے سے مجھے کیوں ہٹا دیا

★★

☆
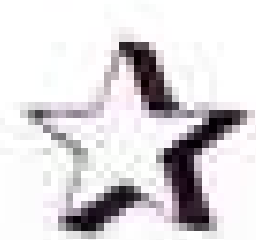
اپنے ہی پیچ و تاب میں زلفِ بتاں الجھ گئی
میرے جنونِ شوق سے عقل کہاں الجھ گئی

جیسے کسی چٹان سے جوئے رواں الجھ گئی
گاہ یہاں الجھ گئی، گاہ وہاں الجھ گئی

دشمنِ ہوشیار کی ریشہ دوانیاں نہ پوچھ
میرے ہی جسم سے حفیظ خود مری جاں الجھ گئی

☆

اے کاش یہ خبر بھی سنیں ہم کہ شیطنت
قدموں پہ آدمی کے گری اور مر گئی

تخئیل میں، خیال و گماں میں، یقین میں
آئے نظر وہ ہم کو جہاں تک نظر گئی

مرنے سے ہچکچانے لگے دل اگر حفیظ
بس جان لیجیے کہ جوانی گزر گئی

☆☆

☆
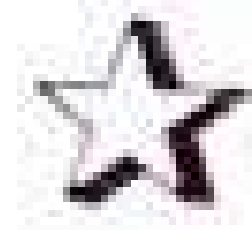
محنت پاتی ہے انعام
جس کی تھکن اُس کا آرام

رند رہے جب تشنہ کام
ساقی پر آیا الزام

ساجھے کا مے خانہ ہے
اِس کی صراحی اُس کا جام

سب کے اپنے مسائل ہیں
آئے کون کسی کے کام

ہنسنا کیا ہے بے خبری
رونا مجبوری کا نام

محنت کی بیداری سے
سرمائے کی نیند حرام

کیا ہے بغل میں یہ تو بتا
منھ پر تو ہے تیرے "رام"

اِس کو کانٹے اُس کو پھول
سب کے حصے نام بنام

ہمّت نے انگڑائی لی
مایوسی کا کام تمام

سنتا جا میری تنقید
دیتا جا مجھ کو دشنام

شہرت ایک مصیبت ہے
اچھا تھا رہتے گمنام

مر گیا شاید آج حفیظؔ
اہلِ سخن میں ہے کہرام

★★

☆
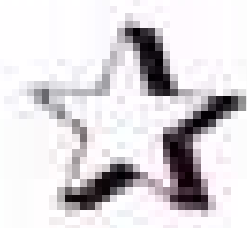
ہم خلوص والے ہیں یہ بھی کر دکھائیں گے
تہمتیں خریدیں گے خدمتیں لٹائیں گے

یا تو ہوں گے زنداں میں یا ملیں گے مقتل میں
بزدلوں کی محفل میں ہم نظر نہ آئیں گے

اس لئے بھی اپنوں کو منھ نہیں لگاتے وہ
ننگے بھوکے رشتہ دار آئے تو ستائیں گے

اُس سے کچھ طلب کر کے ہم نہ ہوں گے شرمندہ
مہرباں نہ ہونے کا فائدہ اٹھائیں گے

چکھ لیا ہے اب ہم نے ذائقہ قناعت کا
جذبہ ہوس تیرے ہاتھ ہم نے آئیں گے

جب وہ ہم کو پیارے ہیں ان کی ہر عطا پیاری
گر فریب دیں گے وہ ہم فریب کھائیں گے

موقع و محل کو بھی دیکھتے نہیں کچھ لوگ
"داستاں سنانی ہے داستاں سنائیں گے"

ان حسین لمحوں کا انتظار ہے ہم کو
جب ہم ان سے روٹھیں گے وہ ہمیں منائیں گے

اے حفیظؔ برپا ہے بزم نوجوانوں* کی
لاکھ روکے بیماری ہم ضرور جائیں گے

★★

* حفیظ کی آخری غزل جو انہوں نے اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (ایس آئی او) کیڈر کیمپ ... کے جلسے میں پڑھی۔ مقطع خصوصی طور پر ایس آئی او کے نوجوانوں کے لئے کہا گیا ہے۔ م۔)

نظمیں

☆
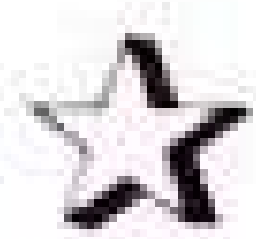
منقبت
حضرت ابوبکر صدیقؓ

میں کیسے مان لوں ان کو دلِ زندہ میسر ہیں
نہیں صدیقؓ کے جو معترف پتھر سے بدتر ہیں

جو اصحابؓ پیمبرؐ ہیں مقدس ہیں منور ہیں
علاماتِ چراغِ مسجد و محراب و منبر ہیں

مسلم ہیں، معظّم ہیں، معزز ہیں، موقر ہیں
"بیانِ مختصر یہ ہے کہ وہ صدیقؓ اکبر ہیں"

صحابہؓ کا سا ایمان و عمل کس دور نے دیکھا
مسلماں ہم بھی ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر ہیں

میں اخلاصِ مجسّم کو منافق کس طرح کہدوں
مرے پیشِ نظر دوزخ کے عبرتناک منظر ہیں

نفاقِ باہمی ہے موت کا پیغام ملت کو
اشارہ کر رہے ہیں اب زمانے کے جو تیور ہیں

فقط نامِ خدا، نامِ محمدؐ چھوڑ کر گھر میں
جو سب کچھ پیش کر دیتے ہیں وہ صدیقؓ اکبر ہیں

کسی قابل نہیں پھر بھی حفیظؔ اس بزمِ اقدس میں
یہ گلہائے عقیدت ذکر پر اُن کے نچھاور ہیں

★★

☆
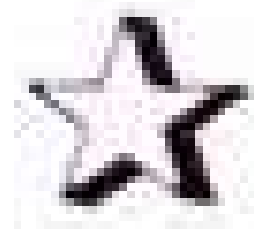
منقبت

حضرت صدیق اکبرؓ

باقی کہاں رہ جائے گا ایمان کا معیار
صدیقؓ کی عظمت سے اگر کر دیا انکار

شعبِ ابی طالب ہو کہ ہو مرحلۂ غار
صدیقؓ وفادار ہیں صدیقؓ فداکار

منفی ہی نہیں آپؓ کا مثبت بھی ہے کردار
باطل کے مخالف ہیں وہ حق کے ہیں طرفدار

کیا بات ہے بوبکرؓ کے ایمان و عمل کی
ایثار ہی ایثار ہیں کردار ہی کردار

رحمت کو حفیظؔ اس پہ ہنسی آتی ہے شاید
اشعار سنا کر ہوں میں بخشش کا طلبگار

★★

☆
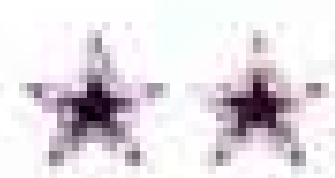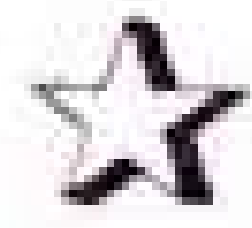
منقبت

حضرت عمر فاروقؓ

طاری نظامِ کفر پہ ہیبت عمرؓ کی تھی
شمشیر بے نیام حمیت عمرؓ کی تھی

باطل کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی
فتنے دبے رہے کہ خلافت عمرؓ کی تھی

اللہ رے اجتہاد بجا ہے اگر کہیں
مضمون تھا نبیؐ کا عبارت عمرؓ کی تھی

راتوں کو گشت کر کے غریبوں کی دیکھ بھال
بیدار و ذمہ دار حکومت عمرؓ کی تھی

تنقید کا بھی حق دیا ہر خاص و عام کو
جمہوریت نواز خلافت عمرؓ کی تھی

ٹھہراؤ بھی، جلال بھی، سوز و گداز بھی
کیا جامع الصفات طبیعت عمرؓ کی تھی

ترمیم اپنی رائے میں کی خود حضورؐ نے
کتنی حسیں ادائے بصیرت عمرؓ کی تھی

فتح و ظفر کا قافلہ بڑھتا چلا گیا
یہ دور وہ تھا جس میں قیادت عمرؓ کی تھی

جو اقربا تھے ان کو مَناصب نہیں دیے
دانشورو یہ فہم و فراست عمرؓ کی تھی

وہ حکمراں ملا کہ مثالی کہیں جسے
تاریخ کو شدید ضرورت عمرؓ کی تھی

رکھا نہ پاسباں نہ محافظ کوئی حفیظؔ
اللہ کے سپرد حفاظت عمرؓ کی تھی

★★

☆
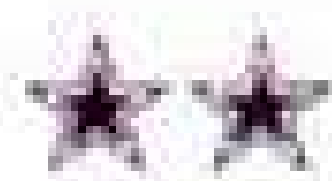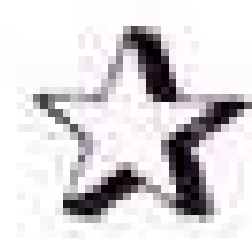
منقبت

حضرت عمر فاروقؓ

صدائیں چوبداروں کی نہ دربانوں کے پہرے ہیں
بہت سادہ مگر با رعب ہے دربارِ فاروقی

پیادہ پا امیرالمومنیں' خادم سواری پر
مثال اپنی نہیں رکھتا ہے یہ کردارِ فاروقی

رعایا کی خبر گیری کی خاطر چھوڑ کر بستر
سکوتِ شب میں گشتِ کوچہ و بازارِ فاروقی

★★

☆
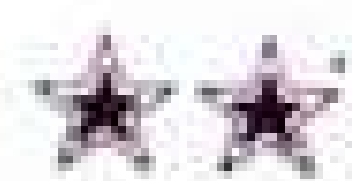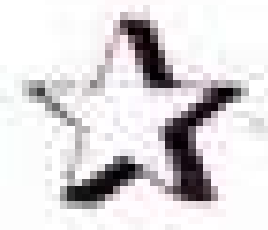
منقبت

حضرتِ عثمان غنیؓ

صفحہ قرآن پر خوں مصحفِ عثمانؓ کا
بن گئی تصویر کیسی خوشنما عثمانؓ کی

دفعتاً بدبخت چہروں پر سیاہی چھا گئی
ہم نے جب تعریف کی ہے برملا عثمانؓ کی

کون ہے معصوم اک ذاتِ پیمبرؐ کے سوا
سخت بے جا ہے مذمّت جابجا عثمانؓ کی

کچھ نہیں بنتا بگڑتا گیدڑوں کے شور سے
قدر خود کرتے تھے جب شیرِ خدا عثمانؓ کی

ہجرتیں بھی خیر سے دو اور ''ذی النورین'' بھی
ہے فضیلت سلسلہ در سلسلہ عثمانؓ کی

جب ہوا گھیراؤ پانی تک پہ پابندی لگی
بن گیا خود اپنا ہی گھر کربلا عثمانؓ کی

کان آقا کا مروڑے حکم آقا سے غلام
عدل نے دیکھی ہے ایسی کبھی ادا عثمانؓ کی

عابد و عادل، حلیم و نرم خو، غازی، شہید
خوبیاں اے معترض یہ کم ہیں کیا عثمانؓ کی

★★

☆
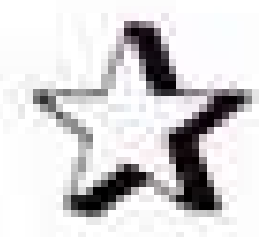
ذکرِ حسینؓ

وہ صبح کا سماں، وہ تلاوت حسینؓ کی
چھائی تھی کربلا پہ متانت حسینؓ کی

پھر کیا کسی حَسین کو خاطر میں لائے دل
جب دل میں بس گئی ہو محبّت حسینؓ کی

قرطاسِ کربلا پہ لہو سے لکھی گئی
دلدوز و تابناک حکایت حسینؓ کی

کتنے ہی مُنہہ چھپا کے گھروں کو پلٹ گئے
سر مانگنے لگی جو رفاقت حسینؓ کی

شاہی کھڑی ہوئی تھی خلافت کے موڑ پر
برحق تھی، برمحل تھی بغاوت حسینؓ کی

للّٰہیت سے بال برابر نہیں ہٹی
انسانیت نواز سیاست حسینؓ کی

تنقید کے غبار سے کچھ بھی نہ ہو سکا
اپنی جگہ وہی ہے نفاست حسینؓ کی

ہر دور کے یزید سے کہدو یہ اے حفیظؔ
تھی، ہے، رہے گی دل پہ حکومت حسینؓ کی

★★

☆
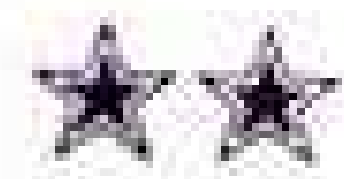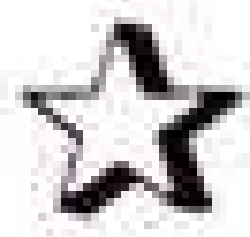
تا بہ کے مصروفِ ماتم

پُرکشش ہوتا نہ اتنا روئے تابانِ حسینؓ
مصلحت کی گرد چھو لیتی جو دامانِ حسینؓ

اے زمینِ کربلا! اے آسمانِ کربلا!
تم نے کن آنکھوں سے دیکھی کشتِ ویرانِ حسینؓ

ہوشِ صہبا ہے کسے، کس کو ہے نغمہ کا دماغ
داستانِ درد ہے اور دردمندانِ حسینؓ

آ کہ چھٹ جائے اندھیرا دورِ بے کردار کا
غیرتِ حق اے چراغِ زیرِ دامانِ حسینؓ

عصرِ حاضر کے یزیدوں سے نبٹنے کے لئے
وہ اٹھا خوں میں نہا کر دیکھ ایرانِ حسینؓ

مرہمِ زخمِ دلِ انسانیت لے کر اٹھو
تا بہ کے مصروفِ ماتم سینہ چاکانِ حسینؓ

سر بکف حق کے لئے رہنا تمہارا کام ہے
اے جوانانِ حسینؓ اے نوجوانانِ حسینؓ

اے خوشا کیفیتِ پاکیزگیِ غم حفیظؔ
بزمِ ذکرِ کربلا ہے یا شبستانِ حسینؓ

★★

☆
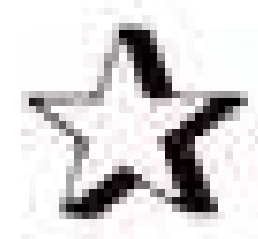
سلام

آجاؤں کاش میں نگہِ انتخاب میں
خدمت گزار ہوں شہِ دیں کی جناب میں

باطل نے پیچ و تاب جو کھایا عتاب میں
حق سربکف تھا ظلم و ستم کے جواب میں

آلِ نبیؐ کے واسطے اک بوند بھی نہیں
یہ ظرف ہے تو آگ لگے جوئے آب میں

بولے حسینؑ زینبِ آشفتہ حال سے
نانا حضورؐ مجھ کو بلاتے ہیں خواب میں

خیبر کی طرح کانپ اٹھی ارضِ کربلا
ابنِ علیؑ نے پاؤں رکھا جب رکاب میں

یوں شہ کے دشمنوں پہ جھپٹتا تھا ذوالجناح
جیسے ہو ذوالفقار کفِ بوترابؓ میں

کرب و بلا کی جنگ نے پردے اٹھا دیے
اب حق حجاب میں ہے نہ باطل حجاب میں

پروانہ وار آئے ہیں اہلِ دل و نظر
روشن ہے شمع، انجمنِ بوترابؓ میں

مصرف تو دیکھئے ذرا عہدِ شباب کا
اکبر شہید ہو گئے عہدِ شباب میں

اس سانحہ سے دنیا ہی اندھیر ہو گئی
کچھ آفتاب میں ہے نہ اب ماہتاب میں

قائل ہوں اہلِ بیت کی عظمت کا میں حفیظؔ
وجہِ سکونِ دل ہے یہی اضطراب میں

★★

☆

سلام

نہ زورِ لفظ و بیاں سے پوچھیں نہ جوشِ طرزِ ادا سے پوچھیں
وفا کے دعوے کی قدر و قیمت کو امتحانِ وفا سے پوچھیں

مقام روحِ شہیدِ اعظم کمالِ صبر و رضا سے پوچھیں
فنا سے پوچھیں، بقا سے پوچھیں، خودی سے پوچھیں، خدا سے پوچھیں

وہ مرکزِ طالبانِ صادق وہ مشعلِ رہبرانِ کامل
کہاں ہے مردانِ حق کی منزل حسینؓ کے نقشِ پا سے پوچھیں

یہ چار بوندوں کے رونے والے جو منھ چڑاتے ہیں تیرے غم کا
کلیجے پھٹ جائیں بادلوں کے اگر کبھی فاطمہؓ سے پوچھیں

نہ جانے دنیا نے سانس لینے کو زندگی کیوں سمجھ لیا ہے
حیات کیا ہے یہ جینے والے شہیدِ کرب و بلا سے پوچھیں

★★

☆
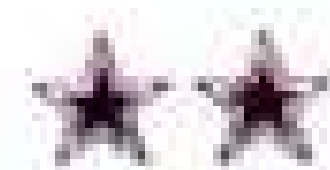
نذرِ مودودیؒ

(یو۔کے۔اسلامک مشن (لندن) کے ایک جلسہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو پیش کیا گیا نذرانۂ عقیدت)

ہمارے کام آ گیا بالآخر خلوصِ ذوقِ سفر ہمارا
جو رہروِ راہِ مصطفےٰؐ تھا بنا وہی راہبر ہمارا

تمہارے اسلوب نے نکھارا ہمارا اندازِ ترجمانی
تمھاری تنقید نے سنوارا مذاقِ نقد و نظر ہمارا

سکھا دیے ہیں ہمارے ساقی نے ہم کو آداب انجمن کے
نہ خامشی رائگاں ہماری نہ بولنا بے اثر ہمارا

بڑے بڑے عزّو جاہ والے، غرورِ فکر و نگاہ والے
جھکائے سر باادب کھڑے تھے جب آ گیا دیدہ ور ہمارا

بفیضِ مودودیِؒ مکرم کہیں غریب الوطن نہیں ہم
ہماری بستی ہے ساری دنیا تمام عالم نگر ہمارا

نہ شرط ہے ملک اور زباں کی نہ قید مخصوص کارواں کی
اقامتِ دیں ہو جس کی منزل وہی شریکِ سفر ہمارا

اشارۂ آفتاب ہیں ہم، علامتِ انقلاب ہیں ہم
اُدھر مچی ظلمتوں میں ہلچل قدم اٹھا ہے جدھر ہمارا

خدا کرے ہو نصیب ہم کو دیارِ احمدؐ میں باریابی
حفیظ لندن میں اک وظیفہ یہی ہے شام و سحر ہمارا

★★

☆

میں ٹوٹ تو گیا ہوں......

(اہلیہ کے سانحہ قتل پر)

اے دل خوشی کا ذکر بھی کرنے نہ دے مجھے
غم کی بلندیوں سے اترنے نہ دے مجھے

گھر ہی اجڑ گیا ہو تو لطفِ قیام کیا ؟
اے گردشِ مدام ٹھہرنے نہ دے مجھے

مقصد یہ ہے سکوں کسی صورت نہ ہو نصیب
اے چارہ ساز بات بھی کرنے نہ دے مجھے

چہرے پہ کھال تک بھی نہ چھوڑیں گے بد نگاہ
اے میرے خیر خواہ ! سنورنے نہ دے مجھے

ہے دیکھنے کی چیز جو بسمل کا رقص بھی
دنیا یہ چاہتی ہے کہ مرنے نہ دے مجھے

یہ دورِ سنگ دل ہی نہیں تنگ دل بھی ہے
گر بس چلے تو آہ بھی کرنے نہ دے مجھے

اب بھی یہ حوصلہ ہے کہ کچھ کام آ سکوں
میں ٹوٹ تو گیا ہوں بکھرنے نہ دے مجھے

★★

☆
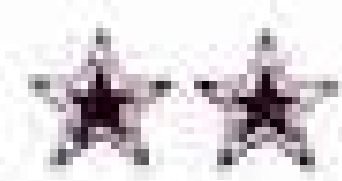
درد ہمارا

(اہلیہ کے سانحہ قتل کے بعد)

پُرسش غم نے غم کو اُبھارا
شاد رہے غم خوار ہمارا

بھیگی آنکھیں سوجی سوجی
جلتی چھاتی دل انگارہ

حال جو رسماً پوچھ رہے ہیں
وہ کیا جانیں درد ہمارا

سچ سے کوسوں دور ہو جیسے
ہنستا ہے اک غم کا مارا

بیکس کے مہمان سدھارے
سُونا سُونا گھر بے چارہ

کیسے پوری ہوگی کہانی
کوئی نہیں دیتا ہنکارہ

صبر کا دامن چھوٹ نہ جائے
ضبط کو پھر غم نے للکارا

تم بھی حفیظؔ زار سے ملنا
سکھ بانٹے ہے وہ دُکھیارا

★★

☆
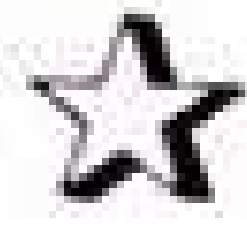
تاثرات
یومِ روش صدیقی

اجل کے ساتھ رہا، زندگی کے ساتھ رہا
جہاں جہاں وہ رہا دلکشی کے ساتھ رہا

وہ اک گھناؤنے تالاب کے کنول کی طرح
غلاظتوں میں بھی پاکیزگی کے ساتھ رہا

روش کی جرأتِ رندانہ کا جواب نہیں
خرد کے دور میں دیوانگی کے ساتھ رہا

قدم قدم پہ نگہبانِ شانِ عجز ہوا
وہ بانکپن جو تری سادگی کے ساتھ رہا

ادا ادا سے ٹپکتی تھی مشرقی تہذیب
سلیقہ مند تھا شائستگی کے ساتھ رہا

خلوص کیش، محبّت شعار، فرض شناس
وہ آدمی کی طرح آدمی کے ساتھ رہا

جہاں ہوس ہے سمندر میں ماہیِ بے آب
وہ ریگ زار میں آسودگی کے ساتھ رہا

لبوں پہ موجِ تبسم تو پیار آنکھوں میں
ہجومِ غم میں بھی زندہ دلی کے ساتھ رہا

★★

☆
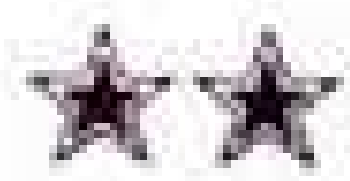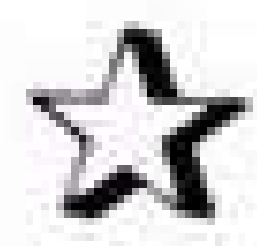
بہ یادِ بہادر شاہ ظفرؔ

اربابِ نظر، اہلِ ہنر پیش کیے ہیں
دلّی نے بھی کیا کیا گلِ تر پیش کیے ہیں

کھاتے ہیں قسم جن کے تقدّس کی فرشتے
اِس خاک نے ایسے بھی بشر پیش کیے ہیں

اردو کو نہ دو ہند کی تقسیم کا طعنہ
ہاں ہاں اِسی اردو نے ظفرؔ پیش کیے ہیں

ہم خوب سمجھتے ہیں تجھے گردشِ دوراں
ساحل کے عوض تو نے بھنور پیش کیے ہیں

جب سامنے آیا ہے کلامِ شہِ مظلوم
آنکھوں نے مری لعل و گہر پیش کیے ہیں

تعمیرِ وطن کا جو چھڑا ذکر تو ہم نے
لٹتے ہوئے جلتے ہوئے گھر پیش کیے ہیں

اے مغربی تہذیب تجھے شرم نہ آئی
جب شاہ کو شہزادوں کے سر پیش کیے ہیں

★★

☆
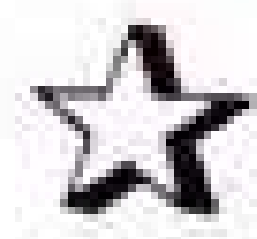
ایمر جنسی

کلیجہ رکھ دیا میرے وطن کا برما کر
یہ کس نے تھوپ دی لعنت کہاں سے منگوا کر

نہ گفتگو، نہ کوئی تبصرہ، نہ کچھ تنقید
سب اہلِ فکر و نظر رہ گئے ہیں پتھرا کر

صحافیوں نے خوشامد کی انتہا کر دی
قصیدے پڑھتے ہیں فرعونیت کے گا گا کر

خودی فروش سخنور، قلم فروش ادیب
اٹھے حمایتِ سرکار کی قسم کھا کر

ڈھٹائی دیکھئے بااختیار مجرم کی
کیا ہے وار عدالت پہ اس نے جھلا کر

یہاں تو زور سے رونے پہ بھی ہے پابندی
یہ شہرِ جبر ہے آہوں پہ ہی گزارا کر

بڑے بڑوں کی بڑائی کا اعتبار اٹھا
جو سر بلند ہیں بیٹھے ہیں سر کو نیوڑھا کر

ذرا کچھ ایسا برہمن کی برہمی سے شیخ
کہ اس نے بت کو خدا کہہ دیا ہے گھبرا کر

صفایا کر دیا للّٰہیت کا صوفی نے
نئے رموزِ تصوف کی معرفت پا کر

سُریلے گیتوں کے دم گھٹ رہے ہیں سینوں میں
اٹھائی سر پہ زمیں مینڈکوں نے ٹرّا کر

مجاہدوں نے بھی ڈاکو سے دوستی کر لی
خموش ہو گئی روحِ جہاد چلّا کر

کسی کے منہ سے بھی ایمان کی اگر نکلی
جھڑک دیا ہے اسے مولوی نے غرّا کر

پرانے پاپی بھی مشہور ہو گئے معصوم
ہوس پناہ حکومت کی گود میں جا کر

جو سر فروش تھے منھ ڈھانپ کر یہ کہتے ہیں
لڑے گا ظالم و جابر سے کوئی کیا کھا کر

حفیظؔ کو بھی ہے تائیدِ ظلم کی تاکید
یہ لوگ شمع سے کہتے ہیں تو اندھیرا کر

★★

☆
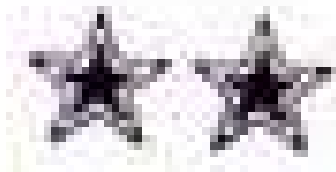
آزادی

(ریڈیو اسٹیشن جموں کی فرمائش پر)

نہ بھول جائیں کہیں غازیانِ آزادی
بہت ہی سخت ہے یہ امتحانِ آزادی

رہی ہو طوق و سلاسل سے دوستی جن کی
انھیں کو حق ہے کہ ہوں ترجمانِ آزادی

زباں کے ساتھ قلم سر بھی ہو گئے لیکن
بلند پھر بھی رہا ہے نشانِ آزادی

جو اس کے نام سے کانوں پہ ہاتھ دھرتے تھے
سناتے پھرتے ہیں اب داستانِ آزادی

قفس کو خُلد بنا دیتا ہے کبھی صیّاد
کچھ اور چیز ہے لیکن جہانِ آزادی

نئی سحر کی حفاظت بہت ضروری ہے
رہے خیال یہ اے پاسبانِ آزادی

اسیرِ زلفِ غزل ہی سہی حفیظؔ مگر
اسے ہے فخر کہ ہے نغمہ خوانِ آزادی

★★

☆
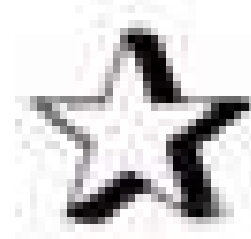
نغمۂ آدم

(شاعری کے ابتدائی دور کی ایک نامکمل نظم)

میرے ساز میں افسوں، میرے گیت میں افسوں
ابر بن کے چھا جاؤں، برق بن کے لہراؤں

گر نہیں، نہیں کچھ بھی اور جو ہوں تو ہوں سب کچھ
چپ رہوں تو پُتلا ہوں پھٹ پڑوں تو انساں ہوں

میں نے اس جہنم سے جنتیں تراشی ہیں
میں بھی ایک خالق ہوں میں بھی ایک خالق ہوں

اِس طرف اندھیرا ہے، اُس طرف اندھیرا ہے
اے خرد کدھر جاؤں، اے جنوں کدھر جاؤں

دشت و شہر پر ظلمت، ماہ و مہر پر ظلمت
سب کو جگمگا دوں یا شمعِ دل بھی گل کردوں

بزمِ ہر دوعالم میں جاؤں بے حجابانہ
آئینہ بھی خلوت میں دیکھ لوں تو شرماؤں

کس طرح مٹے دوری، طے ہو فاصلہ کیسے
تو ہی فرش پر آئے یا میں عرش پر جاؤں

کیا کروں کھلونوں سے جی نہیں بہلتا اب
لے یہ روز و شب اپنے، یہ زمین، یہ گردوں

★★

☆
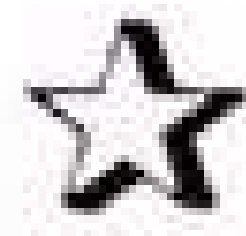
امن کی شبنم

(ہندی روزنامہ "دینک جاگرن" کی فرمائش پر اس کے ایک عید ایڈیشن کے لئے حفیظؔ میرٹھی نے یہ نظم قلم بند کی تھی۔ ایسی وقتی اور فرمائشی چیزوں کو وہ "دباؤ کی شاعری" کے نام سے موسوم کرتے تھے، لیکن میرٹھ کے فرقہ وارانہ ماحول کے پس منظر میں امن واخوت کے زاویہ نگاہ سے اس نظم کا مطالعہ الگ ہی اہمیت کا حامل ہے۔ م)

اشک لیتے ہی نہیں آنکھوں میں آجانے کا نام
عید ہے کیونکہ خوشی کے جام چھلکانے کا نام

جوش مستی کے بھی عالم میں ہے لازم احتیاط
یہ نہیں تہذیب کے حد سے نکل جانے کا نام

ایسا ہنگامہ کہ دنیا ہاتھ کانوں پر دھرے
کیا یہی ہے رنگ پر محفل کے آجانے کا نام

یہ اگر وحشت سے دہشت پر اتر آئے تو پھر
شہر میں بدنام ہو جائے گا دیوانے کا نام

بھائی چارے کا، محبت کا ہے اک تیوہار عید
آدمی کو آدمی کے پاس پہنچانے کا نام

جن کی جانوں نے سہیں پابندیاں رمضان کی
عید ہے ان روزے داروں پر بہار آنے کا نام

کوئی اونچا ہے نہ نیچا سب برابر کے شریک
ہے نمازِ عید بھی یہ بات سمجھانے کا نام

ہم خدا سے روز کرتے ہیں وفاداری کا عہد
یہ نمازیں کیا؟ وَچن دینے، قسم کھانے کا نام

امن کی شبنم سے ہی کھِلتے ہیں تیوہاروں کے پھول
اب نہ لے کوئی چمن میں آگ برسانے کا نام

ہم اگر تڑپیں گے تم بھی بے مزہ ہو جاؤ گے
کون لے گا ماتمی ماحول میں گانے کا نام

عید کا یہ فیض ہے یا پھر سیاست کا کرم
''اپنا'' رکھا جا رہا ہے آج ''بے گانے'' کا نام

عید کے بارے میں سن لیں عابد و زاہد حفیظؔ
یہ نہیں ہے پارسائی پر بھی اِترانے کا نام

★★

☆
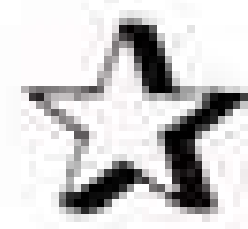
ارتقا

(اس بات کا افسوس ہے کہ حفیظؔ صاحب نے نظم کی طرف مناسب توجہ نہ کی' حالانکہ اس میدان میں بھی وہ کامیاب رہتے۔ میں نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ان سے ایک نظم سنی تھی جس کا عنوان تھا : "مگر انساں ترقی کر رہا ہے"۔ یہ بھرپور تاثیر کی خوبصورت نظم تھی۔

عبدالقدیر اصغر (کراچی) : "حفیظؔ میرٹھی فن اور شخصیت" صفحہ ۱۹۳۔۱۹۴' شائع کردہ : ادارۂ ادب اسلامی ہند)

وہی قوت کا پتلا ابنِ آدم
فنا پر طنز ہے جو مدّتوں سے
وہ جس نے زندگی میں روح پھونکی
وہی اب تجزیوں کی کاوشوں سے
نمک ہے گیس ہے اور کوئلہ ہے
مگر انساں ترقی کر رہا ہے!

ابھی لاشوں پہ بارش قہقہوں کی
ابھی خود زندگی پر بین پہروں
ابھی کچھ حس نہ تھی مختاریوں کی
ابھی خود اپنی تحقیقوں کے ہاتھوں
مجسّم جبر بن کر رہ گیا ہے
مگر انساں ترقی کر رہا ہے

ادھر تو بے زباں فطرت کے رخ سے
حجاب اک اک اٹھایا جا رہا ہے
ادھر حرص و ہوس کی ڈائنوں کو
نئے پردوں میں لایا جا رہا ہے
زمانہ یہ تماشہ دیکھتا ہے
مگر انساں ترقی کر رہا ہے

نظر سے فکر تک، دل سے زبان تک
ہر اک قربت میں لاکھوں بعد پنہاں
کہاں کے راستے، منزل ہے کیا شے
ابھی تو دور ہے خود سے بھی انساں
اور اس پر آسماں چھونے اٹھا ہے
مگر انساں ترقی کر رہا ہے

جہاں میں آج بھی طاقت ہی حق ہے
لہو کمزور کا اب تک ہے پانی
اور اکثر وسعتِ قلبی کی تہ میں
تعصب، تنگ نظری، بدگمانی
یہ سب کچھ ٹھیک ہے، سچ ہے بجا ہے
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

غبارِ آستیں رخصت ہوا گر
سیاہی نے کیا دامن کو رنگیں
گیا تاریک دورِ پادشاہی
تو اب تاریخ کا یہ "عہد زریں"
اندھیری رات بن کر چھا گیا ہے
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

اندھیری رات کے خوں میں نہا کر
وہ دیکھو سرخ سورج آ رہا ہے
ارے یہ انفرادیت کی چیخیں
سویرا شام کو شرما رہا ہے
بھکاری خیر سے داتا بنا ہے
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

یہ گیسیں ہیں یہ پاؤڈر ہیں یہ ایٹم
دمادم دم دمادم دم دمادم
دھماکے' زلزلے' طوفان پیہم
اور اس کے بعد یہ دنیا جہنم
یہی انسانیت کی انتہا ہے
مگر انساں ترقی کر رہا ہے!

★★

☆
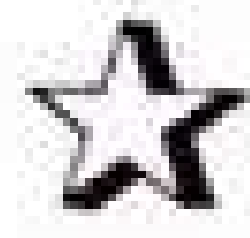
گٹ اپ

(نامکمل نظم)

ذرا یہ بھی قرآن دیکھیں جناب
نہیں اس کے گٹ اپ کا کوئی جواب

بجا ہے کہا تو نے جو کچھ عزیز
حقیقت میں ہے دیکھنے کی یہ چیز

ہے اظہر من الشّمس اس کا جمال
اشاعت ہے یہ واقعی بے مثال

پھسلتی ہے کاغذ پہ اس کے نظر
کتابت سے ثابت کمالِ ہنر

ہیں الفاظ سانچے میں ڈھالے ہوئے
سلیقے میں خود کو سنبھالے ہوئے

کہیں حرف نیلے کہیں ہیں سیاہ
زہے اہتمامِ نشاطِ نگاہ

بکھیری ہیں ہر سمت رنگینیاں
کناروں پہ ''قوس قُزح'' کا سماں

جو نقطوں میں موتی ہیں ٹانکے ہوئے
تو اعراب اس کے ہیں ہیروں جڑے

منوّر درخشاں ہیں سب حاشئے
شفق رنگ آیات کے دائرے

بہت ہی طرحدار ہے سرورق
کہ گٹ اپ کا شہکار ہے سرورق

ہے لاریب جلد اس کی بے حد حسیں
سنہری کہیں اور پیلی کہیں

★★

☆
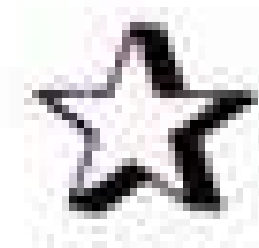
الوداع

(جامعۃ الفلاح، بلریاگنج، اعظم گڑھ کے بچوں کے لئے ایک نظم)

آج شیرازہ رفاقت کا بکھر جانے کو ہے
آؤ مل بیٹھیں کہ رخصت کی گھڑی آنے کو ہے

بھول مت جانا کہ کس مقصد سے آئے تھے یہاں
داستاں میں ہے یہی ٹکڑا تو جانِ داستاں

درسگاہِ دین و دانش ہے ہمارا یہ چمن
دَین ہے اس جامعہ کی مومنانہ بانکپن

گوشے گوشے میں ہے اس خورشیدِ علمی کی کرن
اس کے باکردار بیٹے انجمن در انجمن

رزم گاہِ خیر و شر میں گرم ہے جو معرکہ
دے رہا ہے آپ کو چیلنج اہلِ جامعہ!

خیر کے خیمے سے ہونی چاہئے وابستگی
خیمۂ شر کی طرف جانا سراسر گمرہی

بن کے رہ جانا نہ ہرگز عالمِ دیں نام کے
تم فلاحی ہو سپاہی لشکرِ اسلام کے

ننگِ علمِ دیں ہے، جو عالم عمل سے دور ہے
اپنی ہستی کی ہے منکر شمع جو بے نور ہے

تم محاذِ زندگی پر جاؤ جانبازی کے ساتھ
پیچھے پیچھے ہم بھی آئیں گے جواں مردی کے ساتھ

★★

☆
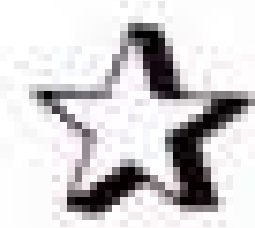
دعائیہ

(ڈاکٹر سراج الدین احمد فرزند جناب حکیم سیف الدین، میرٹھ کی شادی کے موقع پر)

خبر یہ بادِ صبا نے مجھے سنا دی ہے
جنابِ سیف کے نورِ نظر کی شادی ہے

بہت حسین لگا رنگ و نور کا یہ ملن
میاں سراج ہیں دلہا تو نیلوفر ہیں دلہن

مری دعا ہے کہ رشتہ یہ کامیاب رہے
دلہن ہزاروں میں لاکھوں میں انتخاب رہے

اٹھے نقاب تو ہر سو چراغ روشن ہوں
کھلے جو زُلف تو دل اور دماغ روشن ہوں

وفا کی قدر کرے اور وفا شعار رہے
حیات' عفت و عصمت کی پاس دار رہے

سراج! تجھ کو نوازے خدا سعادت سے
ادب سے خُلق و مروّت سے اور محبّت سے

یہ زندگی کا نیا موڑ تجھ کو راس آئے
زمانہ تجھ پہ مسّرت کے پھول برسائے

خود آگہی کا عطا ہو تجھے کچھ ایسا شعور
ترے قریب نہ آئے کبھی ہوائے غرور

ہمیشہ باعثِ رحمت رہے وجود ترا
گرے پڑوں کا سہارا بنے وجود ترا

سدا رہی ہے تمنا یہ حق پسندوں کی
رضا خدا کی ملے اور دعائیں بندوں کی

یقین جان کہ خدمت میں رازِ عظمت ہے
عزیزِ من یہ تری بے بہا وراثت ہے

یہ واقعہ ہے، حقیقت ہے، واعظ و پند نہیں
وہ کیا بنے گا مسیحا جو درد مند نہیں

بڑوں کی راہ پہ چل ان کا نام اونچا کر
فروتنی سے خود اپنا مقام اونچا کر

خیالِ خدمتِ انساں تجھے مدام رہے
خدا کرے کہ تو محبوبِ خاص و عام رہے

★★

☆
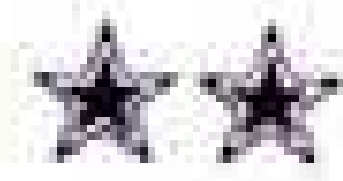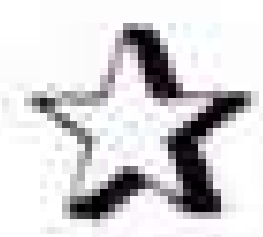
دعائیہ

(خان بہادر بھیا شیخ رشید الدین مرحوم رئیس لال کرتی، میرٹھ، کے پوتے عارف الدین صابری کی شادی پر تحریر کیا گیا حفیظؔ میرٹھی کا یہ دعائیہ فکر اور اسلوب کے اعتبار سے ندرت کا حامل ہے۔ م)

کہا گیا تھا کہ سہرا لکھوں میں عارف کا
مگر یہ کام بہت پہلے میں نے چھوڑ دیا

میں ایسی بزم میں اب خالی ہاتھ کیا جاؤں
دعائیں، نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں

دعا ہے دور رہیں تم سے سارے رنج و محن
سدا بہار بداماں رہے تمہارا چمن

دعائیں تم کو نہ دونگا میں عیش و عشرت کی
کہ زندگی کو ضرورت ہے سخت محنت کی

اگر ارادوں کے خاکہ میں رنگ بھرنا ہے
رفیقِ زیست کو بھی ہم خیال کرنا ہے

تعلقات کی گہرائیاں ہوں دونوں طرف
خدا کرے کہ وفاداریاں ہوں دونوں طرف

دعا یہ ہے کہ زمانہ تمہاری قدر کرے
وہ غیر ہو کہ یگانہ تمہاری قدر کرے

تمہارے ہاتھوں سے صدق و صفا کا باغ لگے
تمام عمر نہ دامن پہ کوئی داغ لگے

قدم قدم پہ بزرگوں کا احترام کرو
چلن یہ گھر کا تمہارے ہے اس کو عام کرو

خدا عطا کرے بے لوث جذبۂ خدمت
اسی سے پائی ہے بھیاؔ رشید نے رفعت

یہ واقعہ ہے نہیں بات کچھ فسانے کی
عظیم ورثہ ہے تہذیب اِس گھرانے کی

خلوص و خدمت و خوش خلقی و رواداری
دعا یہ ہے کہ رہے ان کا سلسلہ جاری

تمہارے سر پہ ہے بھیاؔ شفیع کا سایہ
مرے عزیز یہ نعمت نہیں ہے کم مایہ

کسی رئیس کی دولت کی سمت مت دیکھو
جو صابری ہو تو دامانِ صبر تھامے رہو

یہ کس نے کہہ دیا بے چارگی کا نام صبر
یہ کس نے کہہ دیا پژمردگی کا نام ہے صبر

نئی ہے رسم حفیظؔ اہلِ انجمن کے لئے
دعائیہ یہ تمہارا دلہا دلہن کے لئے

★★
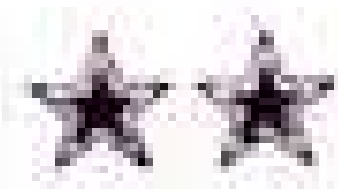
۱۔ عارف الدین صابر (دلہا) ۲۔ بھیا شیخ رشید الدین ایم ایل سی (دولہا کے دادا) ۳۔ بھیا شیخ شفیع الدین صابری (دولہا کے چچا)۔ (م)

☆ سہرا کہنا حفیظؔ کے لیے تکلیف وناگواری کا باعث تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے۔

مرثیوں سہروں، قصیدوں کے تقاضے ہیں حفیظؔ
قدردانوں نے ہمارے خوب پہچانا ہمیں

☆
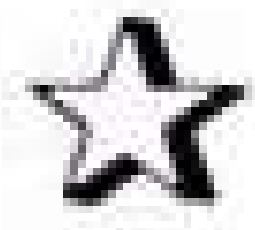
سہرا

(جناب انیس الدین احمد کے اس سہرے کی بازیافت کا سہرا ڈاکٹر ابن فرید کے سر ہے۔ بقول ان کے اس میں اصلاحی افادیت ہی نہیں شعری و معنوی خوبیاں بھی قابل داد ہیں۔ م)

جہاں تخریب زادے نت نئے طوفاں اٹھاتے ہیں
اسی ماحول میں ہم زندگی کے گیت گاتے ہیں

انھیں گیتوں کی اک لے آج کا یہ جشنِ شادی ہے
کہ جس نے انبساط و کیف کی محفل سجادی ہے

مبارک ہو انیس الدین کو سہرا مبارک ہو
یہ زنجیرِ وفا پھولوں کی سرتاپا مبارک ہو

نصیر الدین صاحب کی خوشی کا کیا ٹھکانا ہے
تشکر دل میں ہے لب پر مسرت کا ترانا ہے

زبانِ حال سے خوشحالیاں یہ صاف کہتی ہیں
دعائیں والدہ کی ہر قدم پر ساتھ رہتی ہیں

نظر آنے لگے الفت کے سب آثار سہرے میں
سمویا اس طرح بہنوں نے اپنا پیار سہرے میں

عزیزوں دوستوں کے خواب کی تعبیر ہے سہرا
تمناؤں کی جیتی جاگتی تصویر ہے سہرا

رشید الدین صاحب کی متانت اس میں شامل ہے
جنابِ شمس کی سادہ طبیعت اس میں شامل ہے

دوبالا کر رہے ہیں مرتبہ دلہا کا علم و فن
ہوئی ہے زیورِ تعلیم سے آراستہ دلہن

زمانہ کیوں نہ اس کی غیرتِ دینی کا شاہد ہو
مربّی جس کا خود عاصم علی مردِ مجاہد ہو

عروسِ نو ترے سر پر بڑے پاکیزہ سائے ہیں
تجھے جھولے سے ڈولے تک مقدس ہاتھ لائے ہیں

اِدھر دلہا کے والد آدمیّت کا سراپا ہیں
اُدھر اک پیکرِ انسانیت دلہن کے پاپا ہیں

یہ دونوں ہی خلوص و بُردباری کا نمونہ ہیں
تواضع، انکساری، وضعداری کا نمونہ ہیں

شرافت سے شرافت کے گلے ملنے کا وقت آیا
محبّت سے محبّت کے گلے ملنے کا وقت آیا

دلہن کو ہم دم و دمساز بن جانا مبارک ہو
دلہا کو اک عروسِ باحیا پانا مبارک ہو

الٰہی بے شعوری کی ہواؤں سے بچا اِن کو
نگاہِ امتیازِ حق و باطل کر عطا اِن کو

★★

۱۔ انیس الدین احمد (دولہا) ۲۔ نصیر الدین صاحب (دولہا کے والد) ۳۔ رشید الدین (امیر جماعت اسلامی میرٹھ۔ دولہا کے بڑے بھائی) ۴۔ جناب شمس صاحب (دولہا کے بہنوئی) ۵۔ عاصم علی سبزواری ایڈووکیٹ۔ م)

☆

شُبھ کامنائیں

(ایمرجنسی کے دوران کامریڈ شیو کمار حفیظؔ میرٹھی کے رفیقِ زنداں تھے۔ ایک دن اپنی سالی راجیش کی شادی کا دعوت نامہ پاکر انھوں نے حفیظؔ صاحب سے ایک نظم کہنے کی فرمائش کی۔ حفیظؔ صاحب نے قلم برداشتہ اُن کے جذبات ذیل کے اشعار میں سپردِ قلم کردیے۔ م)

راجیش اور دنیش ہیں جیون کے ہم سفر
دل باغ باغ ہو گیا پہنچی جو یہ خبر

یہ آرزو ہے میں بھی خوشی میں شریک ہوں
پل بھر میں اپنے پیارے عزیزوں سے جاملوں

دل کی اُمنگ کہتی ہے چل اور ضرور چل
ممکن ہو جیسے جیل کے جنجال سے نکل

کیسی ٹرین، کار ہے کیا اور کہاں کی بس
لگ جائیں پر تو اُڑ کے پہنچ جاؤں ہاتھرس

میں چاہتا تھا رشتے کے حق کو ادا کروں
مجبوریوں پہ بس نہیں چلتا کہ کیا کروں

ارمان تھا کہ اپنے بزرگوں کو دیکھتا
غیروں کا حال پوچھتا اپنوں کو دیکھتا

چھوتا چرن کسی کے تو کرتا کسی کو پیار
ملتا گلے کسی سے پہناتا کسی کو ہار

اظہار کس طرح کروں اپنی وفاؤں کا
تحفہ قبول کیجئے شُبھ کامناؤں کا

راجیش اور دنیش کو دیتا ہوں یہ دعا
پھولو پھلو بہار کے دامن میں تم سدا

★★

قطعات

زمیں، سورج، ستارے، چانداور اک نظمِ مستحکم
تجھے یہ سارا عالم بے خدا معلوم ہوتا ہے
خردمندی کا دعویٰ آسماں کو کھوکھلا کہہ کر!
مجھے تو خود ترا سر کھوکھلا معلوم ہوتا ہے

ہونے دے جو ہوتا ہے زمانہ ترا دشمن
تجھ سے کہیں ہو جائے نہ اللہ خفا دیکھ
پھر کوئی بھی غم تجھ کو پریشاں نہ کرے گا
ہر حال میں ہوکر ذرا راضی بہ رضا دیکھ

شعور و آگہی والو! خبر والو! نظر والو!
ذرا دیکھو تو سچائی کا کتنا بول بالا ہے
مجھے میرے وطن کے لوگ سولی پر چڑھادیں گے
اگر کہہ دوں خدا کا حق وطن سے بھی زیادہ ہے

★★

☆

متفرق اشعار

نہ عکسِ رخ ہی دکھایا نہ بانکپن کی جھلک
ترے جمال کے آئینہ دار کیسے ہیں

نسیم چل کے تری انجمن سے آئی ہے
کہ بوئے مشک' دیارِ ختن سے آئی ہے

سارا چمن بہار کی تصویر بن گیا
پھولوں کے ہار شاخوں کو پہنا گئی ہوا

شکستہ حال تھی لیکن جب ان کی یاد آئی
سنور گئی کسی دلہن کی طرح تنہائی

نہ روک پائے گی زنجیرِ کاروبار مجھے
پکارتی ہے کہیں شامِ انتظار مجھے

کچھ اہلِ ہوس کا بھی ٹھکانہ ہے ضروری
میخانہ قریبِ درِ جانانہ بنے ہے

جانے کیا کرتے ہمارا حشر اس کے معتقد
یہ بھی اچھا ہی ہوا واعظ سے ہم الجھے نہیں

تیری بزدل صلح پسندی تجھ کو مبارک ہو اے شیخ
باطل سے یارانہ کرنا اپنے بس کی بات نہیں

آٹھ دس غزلیں مسلسل آٹھ دس غزلیں حضور
سب عطا ہوں، ورنہ پھر بیمار ہو جائیں گے آپ

شعر کی محفل میں نثری نظم جب چلنے لگی
ہم نے بھی رکھا غزل اپنے اک افسانے کا نام

ملا نہ گردِ حقارت میں عظمتِ فنکار
میں تیری زلف ہوں اے زندگی سنوار مجھے

فوٹو جو حفیظؔ اپنا اخبار میں کل دیکھا
تصویر کے پردے میں تشہیر نظر آئی

میں یہی چاہتا ہوں کہ اہلِ نظر
کام سے میرے پہنچیں مرے نام تک

کیوں اس قدر اداس ہو تم ان دنوں حفیظؔ
یوں مسکرا کے بات نہ ٹالو جواب دو

امن کا پیغام تو کس منہ سے دیتا ہے ہمیں
خون اے ظالم ٹپکتا ہے تری شمشیر سے

شیشوں کے نزدیک ہی پتھر رکھے ہیں
ہم نے کچھ ایسے بھی منظر دیکھے ہیں

فقر کی دولت ہاتھ سے دیکر شان و شوکت کیوں مانگوں
میری خودداری ہی یارو میری خود آرائی ہے

پڑیں گے جان کے لالے اگر بڑھے گا جنوں
جنوں پہ ہنستے ہیں یہ ہوشیار کیسے ہیں

چاک دامانی، نہ ہاؤ ہو، نہ کوئی قہقہہ
اس قدر معذور دیوانوں کا صحرا کیا کرے

آہ ان بکھرے ہوئے تاروں کی قسمت اے حفیظ
منتشر ایسے ہیں کوئی ان کو یکجا کیا کرے

تو مالی بن کر آیا تھا مالک کیسے بن بیٹھا
ایک امانت ہے گلشن تو کچھ تیری جاگیر نہیں

ان کی کاٹ کے آگے ٹھہرے یہ کس کا بل بوتا تھا
حاصل جن تلواروں کو ایماں کی پشت پناہی تھی

برسے گا دست و شہر پہ دریا دلی کے ساتھ
ٹکڑا یہ ابر کا ہے سمندر لئے ہوئے

آج کوئی بُت نہیں دیتا صداؤں کا جواب
ایک دن خود ہی پکارے گا صنم خانہ ہمیں

ہم بھی سنتے آئے ہیں ہر زخم کا مرہم ہے وقت
زخم جو تاریخ کے ہیں وہ کبھی بھرتے نہیں

کس حادثہ کی چوٹ نہ جانے کہاں پڑے
دنیا ہے ایک حلقۂ زنجیرِ کائنات

وہ دیکھتے ہی مجھے راستے سے لوٹ گیا
اسے خبر تھی کرم کا امیدوار ہوں میں

فخر سے پڑھتے ہیں سب نسل و نسب کے شجرے
کس کو سمجھائیں کہ مفہومِ شرافت کیا ہے

کیا ضروری ہے بلانا اس سراپا ناز کو
کوئی اپنی خانہ ویرانی کو کیوں رسوا کرے

اک اجنبی کے ہاتھ میں دے کر ہمارا ہاتھ
لو ساتھ چھوڑنے لگا آخر یہ سال بھی

ہم سے نالاں تھا ہماری مسکراہٹ کے سبب
اب زمانے کو یہ شکوہ ہے کہ ہم ہنستے نہیں

مجھ کو ملا ہے ایسا غم
جتنا روؤں اتنا کم

یوں جیا ہوں کہ میرے مرنے کا
میرے دشمن کو بھی ملال ہوا

اور کچھ دیر میں یہ بھی نہ رہے گی ساقی
وہ مری لاش کی پہچان کو آیا ہی نہیں

آج اٹھ گیا حفیظؔ بھی میرٹھ کی بزم سے
یوں لگ رہا ہے جیسے کہ ویرانہ لٹ گیا

کیا صلہ مانگوں میں قربانی کا اپنی اے حفیظؔ
یہ بھی کیا کم ہے مجھے توفیقِ قربانی ملی

ہر شخص مرا محسن ہے حفیظؔ
میں سب کو دعائیں دیتا ہوں

★★

☆
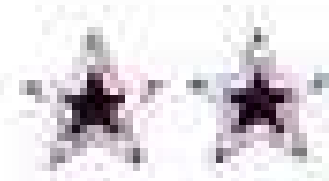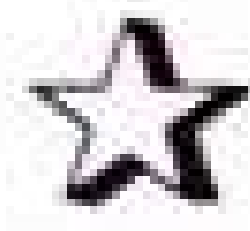
اِشاریہ

صفحہ نمبر ہر صفحہ کے اوپر دیکھئے۔ ہر نعت اور غزل کے مطلع کا مصرعہ ثانی دیا گیا ہے۔

ردیف الف

ردیف ب

ردیف پ

ردیف ت

ردیف ح

★★

حفیظ میرٹھیؒ

نام : حفیظ الرحمان۔ تخلص : حفیظ (میرٹھی)

پیدائش : ۱۰ر جنوری ۱۹۲۲ء بہ مقام میرٹھ

پرورش : نانا منشی خادم حسین کے زیر سایہ ہوئی۔

تعلیم : انٹرمیڈیٹ

ملازمت : کلکٹریٹ اور فیضِ عام انٹر کالج، میرٹھ

سبکدوشی ملازمت : ۱۰ر جنوری ۱۹۸۲ء

آغاز شاعری : ۱۹۴۰ء کے آس پاس شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا وجدان اور مطالعہ ہی ان کا رہنما رہا۔

ادبی خدمات : ۱۹۵۰ء کی دہائی میں معروف ادبی رسالے 'معیار' کی ادارت کرتے رہے اور اسی دور سے تاحیات ادارۂ ادبِ اسلامی ہند سے وابستہ اور اس کے ذمہ دارانہ منصبوں پر فائز رہے۔

قید وبند : ۱۹۷۵ء میں ڈی۔ آئی۔ آر اور ۱۹۷۶ء میں میسا کے تحت گرفتار کئے گئے۔

بیٹے کی وفات : ۱۹۷۶ء میں قید وبند کے دوران ہی انتقال ہوا۔

اہلیہ کا قتل : ۳۱ر مارچ ۱۹۸۲ء

ادبی تخلیقات : شعر وشعور، اشاعت مئی ۱۹۷۰ء

متاعِ آخرِ شب، اشاعت دسمبر ۱۹۸۶ء

گہرائیاں : متاعِ آخرِ شب، ہندی رسم الخط میں، اشاعت ۱۹۹۸

ادبی سفر : پاکستان، برطانیہ، امریکہ، قطر، سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک۔

ادبی جشن : ادارۂ ادبِ اسلامی ہند نے ملک گیر سطح پر دہلی میں منایا، اکتوبر ۱۹۹۱ء

اہلِ میرٹھ نے منایا، دسمبر ۱۹۹۳ء

فن اور شخصیت : غالب اکیڈمی میں حفیظ میرٹھی کے فن اور شخصیت پر پڑھے گئے مقالات کا شاندار مجموعہ ادارۂ ادبِ اسلامی ہند نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔

پس ماندگان : دختر ـــ حسین غزالہ فلاحی

وفات : ۷ر جنوری ۲۰۰۰ء ، بہ مقام میرٹھ

★ ★ ★

Shakir Adeel,
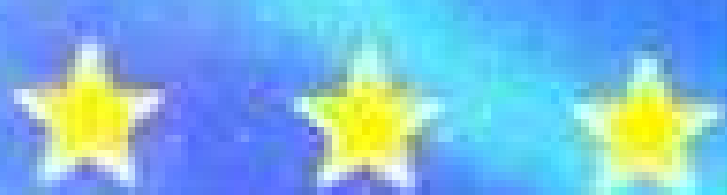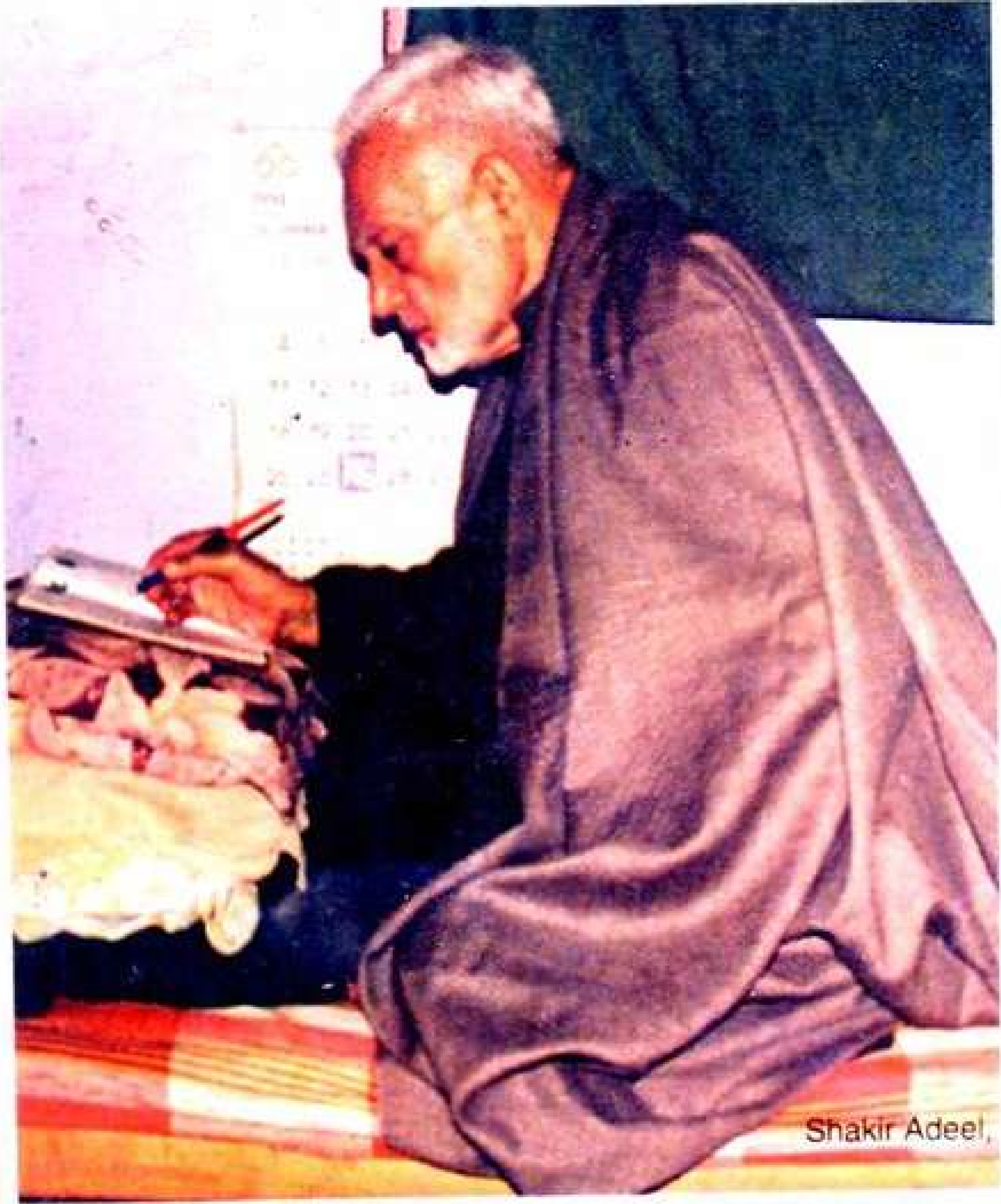
حفیظ میرٹھیؒ

یہ بھی تو سوچئے کبھی تنہائی میں ذرا

دنیا سے ہم نے کیا لیا؟ دنیا کو کیا دیا؟